UNIVERSAL LIBRARY
OU_222037
UNIVERSAL LIBRARY

# فہرست


۱) میلے کا جھٹکا ـــــ ۵
۲) شیخ جعفر صلاح لیڈر کیسے بنا ـــــ ۱۹
۳) ایک عورت ـــــ ۴۲
۴) شاہ جہاں کی تصویر ـــــ ۴۹
۵) ملکہ کی شانک ـــــ ۵۹
۶) کلو قانونی ـــــ ۶۵
۷) نئی اصطلاحات ـــــ ۷۸
۸) قصہ سوتے جاگتے کا ـــــ ۸۹
۹) اس کے پڑھنے سے
بہتوں کا بھلا ہوگا ـــــ ۱۰۱
۱۰) الف لیلہ کا نانی ـــــ ۱۱۷
۱۱) ایک تمار راجہ ـــــ ۱۲۴
۱۲) بھینس ـــــ ۱۲۸
۱۳) مرزا ناقر کے خطوط ـــــ ۱۳۵
۱۴) سرائے رسائی کا افسر افسانہ ـــــ ۱۴۶
۱۵) کسان کا خواب ـــــ ۱۴۹
۱۶) کتی ـــــ ۱۵۳
۱۷) انتخاب (Election) ـــــ ۱۶۲
۱۸) شاہ الف صیں ـــــ ۱۷۱

# Osmania University Library

Call No. ٨٩١٥٣٣٢

Accession No. U.13318

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

# دیباچہ

یہ میرے چند متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے اکثر "شیرازہ" میں چھپ چکے ہیں بعض ایسے بھی ہیں۔ جو اس سے پہلے کہیں نہیں چھپے۔

اس مجموعہ میں زیادہ تر انگریزی زبان کے افسانے ہیں جنہیں میں نے اُردو کے قالب میں ڈھال لیا ہے۔ مثلاً "کیلے کا چھلکا" ول اسکاٹ کے ایک افسانے سے ماخوذ ہے۔ "اس کے پڑھنے سے بہنوں کا بھلا ہوگا" او ہنری کے ایک افسانے کا چربا ہے۔ "کلو قانونی" ڈبلیو ڈبلیو جیکبز کا مال ہے۔ اور میں نے اسے اپنا لیا ہے۔

بعض مضامین کا ترجمہ بالکل نقل مطابق اصل ہے۔ مثلاً "لکڑی کی ٹانگ" کے ترجمہ میں اصل سے بہت کم انحراف کیا گیا ہے۔

"مُرتّا" چینی افسانہ نگار باجز کے ایک افسانہ کا ترجمہ ہے اور حاجی جعفر حلّاج

مشہور ایرانی انشا پرداز جمال زادہ کا رشحۂ قلم۔ ان دونوں افسانوں کے ترجمہ میں میں نے اصل کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کی ہے۔ اصلاحات ریڈیو کی ایک تقریر ہے۔ جسے ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے شائع کیا جا رہا ہے۔

مجموعہ کا نام تجویز کرنے کا مسئلہ بہت بے ڈھب تھا۔ کئی نام ذہن میں آئے۔ ان میں مضامین سندباد اور سندباد کے مضامین اچھے خاصے نام تھے۔ لیکن یہ دونوں حنیف صاحب کو پسند نہ آئے۔ آخر میں نے کہا۔ کہ "کیلے کا چھلکا" اور دوسرے مضامین" ہی سہی۔ کیلے کے چھلکے کا نام سُن کر حنیف صاحب پھسل گئے۔ اور اب یہ مجموعہ اسی نام سے شائع ہو رہا ہے۔

(سندباد جہازی)

# کیلے کا چھلکا

۱۷ فروری ۱۹۲۷ء کی رات کو نواب چھٹن نہر کے کنارے پودے چلے جا رہے تھے۔ کہ ایک کیلے کے چھلکے پر سے جو خدا جانے کس نا شدنی نے وہاں پھینک دیا تھا۔ پاؤں پھسلا۔ اور نواب عالی قدر غڑاپ سے نہر میں جا رہے ذرا ۱۷ فروری ۱۹۲۷ء کی تاریخ دھیان میں رکھئے اگر بلرام پور کے شیخ شبراتی اس موقع پر موجود نہ ہوتے۔ تو دنیا نواب چھٹن کو نیلی کوٹھی والے مرحوم نواب چھٹن کے نام سے یاد کرتی۔ اب یہ سنئے کہ شیخ شبراتی نے نواب چھٹن کی جان کیسے بچائی؟

کہتے ہیں کہ جب شیخ جی نے جو نہر کے پاس سے گذر رہے تھے۔ پانی میں بلبلے سے اٹھتے دیکھے۔ تو بول اٹھے "ہائیں یہ کیا؟ ادھر سے نواب چھٹن بھی پکار اٹھے۔ کہ اماں بچائیو۔ میں ڈوبا" شیخ شبراتی نے اچکن اتارتے ہوئے کہا "یار ابھی نہ ڈوبیو! میں آتا ہوں"

شیخ جی نے نہر میں کودتے ہی نواب کو بالوں سے پکڑ لیا۔ کہنے لگے تم بھی

ذرا ہاتھ پاؤں مارو۔ تمہیں تو تیرنا بھی نہیں آتا۔ مجھے نہ مارو بھئی۔ ہاتھ پاؤں مارو۔"

غرض شیخ شبراتی نے نواب چھٹن کو کھینچ کھانچ کر کنارے پہنچایا لیکن کنارے پہنچنے سے پہلے نواب صاحب کو اس بات کا احساس ہو چلا تھا۔ کہ اگر یہ مرد آدمی آج یہاں نہ ہوتا تو وہ مرحوم باپ نواب رفیع الشان کے پاس پہنچ چکے ہوتے۔ چنانچہ کنارے پہنچتے ہی انہوں نے کہا یار اگر تم یوں نہر میں کود نہ پڑتے تو میں ختم ہو چکا تھا۔"

شیخ شبراتی کہنے لگے "آج زیادہ کھا گئے تھے کیا؟"

نواب نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ادر ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے کہنے لگے "بھئی تم نے میرا چشمہ تو نہیں دیکھا؟"

"ارے یار اس حالت میں بھی تمہیں چشمہ کی پڑی ہے۔ ذرا اپنی طرف دیکھو تو سہی۔ سارا لباس چوپٹ ہو رہا ہے۔

"بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نہر میں گرا کیسے؟"

"معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز پر سے تمہارا پاؤں پھسل گیا۔"

"آخر کاہے پر سے"

"شیخ شبراتی ادھر اُدھر ٹٹول کر بولے "لو مل گیا۔"

"میرا چشمہ"

"جہنم میں جائے تمہارا چشمہ مجھے تو وہ کیلے کا چھلکا ملا ہے جس پر سے تمہارا پاؤں پھسلا تھا۔ اب میری صلاح مانو۔ تو سیدھے گھر چلے جاؤ۔ کپڑے اتار کر سو جاؤ اگر تھوڑی سی برانڈی مل جائے تو سبحان اللہ"

"کمبخت برانڈی کا ہی تو سارا فساد ہے۔ اگر آج کچھ زیادہ نہ پی گیا ہوتا۔ تو کیا مجھے کیلے کا چھلکا نظر نہ آجاتا"

"تم رہتے کہاں ہو؟"

"میں پاس ہی رہتا ہوں۔ آؤ چلیں۔ ہاں بھئی۔ میں تو تمہارا نام بھی نہیں جانتا"

"میرا نام شبراتی ہے شیخ شبراتی"

"عجیب بات ہے میں نے تمہارا نام پہلے کبھی نہیں سنا حالانکہ تم نے ابھی ابھی میری جان بچائی ہے"

"آؤ چلو۔ میں تو سردی سے ٹھٹھرا جا رہا ہوں"

"ہاں چلو لیکن بھئی تمہیں معلوم ہے۔ کہ اگر تم نہ ہوتے تو آج میں ڈوب گیا ہوتا"

"اب اسے بھول بھی جاؤ"

"کیسے بھولوں۔ مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔"

اتنے میں نیلی کوٹھی کا بیرونی پھاٹک آگیا۔ اور نواب چھٹن اس کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ شیخ شبراتی نے پوچھا "یہاں کیوں ٹھہر گئے؟"

"اچھا۔ اب رخصت۔ میں یہیں رہتا ہوں لیکن میاں تم نے میری جان بچائی ہے۔ اور مجھے تمہاری کوئی نہ کوئی خدمت ضرور کرنا چاہیئے۔ اچھا تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟"

"لاحول ولاقوۃ۔ ابھی سے نام بھول گئے۔ میرا نام شیخ شبراتی ہے۔"

"لیکن میاں شیخ شبراتی! تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں جانتا تک نہیں عمر بھر میں یہ پہلی مرتبہ تمہارا نام سنا ہے۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ کل یہاں نیلی کوٹھی میں ضرور آئیو۔ اور مجھ سے ملیو۔"

"لیکن تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام! میرا نام چھٹن ہے۔ چھٹن۔"

"چھٹن۔"

"ہاں چھٹن۔ تو اچھا خدا حافظ۔ میں تمہارا نام تو نہیں جانتا لیکن تم نے بڑا احسان کیا ہے۔ مجھ پر۔ جان بچائی ہے میری اچھا خدا حافظ۔ کل ضرور ملیو۔ میرا نام

چھٹن ہے۔ خدا حافظ! خدا حافظ!!"

یہ کہہ کر نواب چھٹن تو نیلی کوٹھی میں گھس گئے۔ اور ہمارا شیخ شبراتی اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ یہاں سے اس کا گاؤں کوئی تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ ایک تو اندھیری رات۔ دوسرے سارے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ بچارا بڑی مشکل سے گرتا پڑتا گھر پہنچا۔ اور سارا راستہ یہی سوچتا گیا۔ خوب آدمی ہے یہ چھٹن بھی کوئی سائیس یا خانساماں معلوم ہوتا ہے۔ اور کیا عجب ہے، کہ کسی بڑے آدمی کا داروغہ ہو۔

---

نواب چھٹن بڑے عالی خاندان رئیس تھے لیکن کچھ ان کے باپ کی فضول خرچی اور کچھ ان کے اتنے تلتوں کی بدولت وہ پہلی سی بات نہیں رہی تھی۔ نیلی کوٹھی کے ارد گرد ہزاروں ایکڑ زمین تھی جس میں سے بہت سی بک گئی تھی۔ اور جو باقی رہ گئی تھی۔ وہ بھی نواب کے ہاتھوں سے نکلتی چلی جا رہی تھی لیکن نیلی کوٹھی کا ٹھاٹھ باٹھ ابھی تک وہی تھا۔ اس لیئے شیخ شبراتی نے پھاٹک کے اندر قدم رکھا۔ تو بہت چکرایا۔ کہ الٰہی میں کہاں آگیا؟ ایک خدمت گار نے بڑھ کر روکا۔ کہ تمہیں یہاں کیا کام ہے؟ خدمت گار نے کچھ ایسے بھڑکیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور گفتگو کا انداز ایسا تھا۔ کہ بچارا شیخ بدحواس

ہوگیا۔ اور کہنے لگا حضور! مجھے یہاں میاں چھٹن سے ملنا ہے۔"

خدمت گار بولا "میاں چھٹن تو یہاں نہیں رہتے۔ یہ تو نواب چھٹن کی کوٹھی ہے۔"

"یونہی سہی۔"

"کیا کام ہے تمہیں؟"

"یونہی ان سے ذرا ملنے چلا آیا تھا۔"

"ملنے چلے آئے تھے۔ آپ۔ لیکن ——

"میں خود تھوڑے ہی آیا ہوں۔ انہوں نے بلایا تھا۔"

خدا جانے خدمت گار کیا کہتا۔ اور شیخ شبراتی پر کیا گزرتی؟ حسنِ اتفاق سے خود نواب چھٹن کسی کام کو برآمدہ میں چلے آئے۔ شبراتی نے انہیں دیکھتے ہی غل مچایا "چھٹن"۔ نواب چھٹن "چونک پڑا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شبراتی کو تکنے لگا۔ شبراتی بولا "کہو۔ اچھے تو ہو۔ میں ذرا یونہی ملنے چلا آیا تھا۔"

نواب چھٹن لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے "کیا تم سے۔ میری جان پہچان ہے۔"

"بس بھول گئے؟"

"نہیں تو ـــــ تمہارا چہرہ مجھے کچھ چشم آشنا معلوم ہوتا ہے۔ یاد نہیں آتا۔ میں نے تمہیں کہاں دیکھا ہے؟"

"وہ نہر کی بات یاد ہے"

"ہاں اب یاد آیا۔ آؤ اندر چلو"

نہر کا نام سن کر خدمت گار بہت گھبرایا۔ کہ خدا جانے کیا قصہ ہے۔ دم بھر میں یہ خبر سارے نوکروں میں مشہور ہو گئی۔ اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔

---

نواب چھپٹن شیخ شبراتی کو دیوان خانہ میں بٹھا کے کہنے لگے "اب مجھے یاد آیا۔ رات کو میں نہر میں غوطے کھا رہا تھا۔ کہ تم نے میری جان بچائی۔

"اماں اسے بھول بھی جاؤ"

کیسے بھولوں بھائی۔ تمہارا بڑا احسان ہے مجھ پر۔ اب کہو۔ میں تمہاری کیا خدمت کروں"

"کچھ بھی نہیں میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ گرمیوں میں شربت بیچتا ہوں۔ جاڑے میں نان کباب۔ ایک مرغی خانہ بھی کھول رکھا ہے انڈوں اور

مرغیوں سے بھی خاصا نفع ہو جاتا ہے۔ اور کیا چاہیئے۔ ہم تم دوست ٹھہرے
اب دوست سے کوئی کیا مانگے "

"ہم تم دوست تو ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے تمہارے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے"

"تمہیں ایسا ہی اصرار ہے تو اپنے ہاں کے سنگتروں کی ایک ٹوکری بھجوا دو
اور بھجوانا کیا ہے۔ میں خود ہی لیئے جاتا ہوں "

غرض شیخ شبراتی نے باغ میں پہنچ کر اچھے اچھے سنگترے چھانٹے۔ اور
انہیں لے کر گھر کا رُخ کیا۔ لیکن اتفاق یہ کہ نواب سے اسکی جو باتیں ہوئی تھیں
وہ باورچی کے چھوکرے نے سُن پائیں۔ اس نے اپنے باپ کو سارا قصہ سنایا
اس نے بُوالطیفن سے کہا۔ اور بُوالطیفن نے نواب چھٹن کی خالہ
خورشید لقا بیگم کو جا سُنایا۔ یہ بیگم بڑی سلیقہ والی اور دانش مند خاتون تھی۔
نواب کی جاگیر کا سارا انتظام اسی کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے سُنا تو نواب
کو بُلا بھیجا۔ اور کہا "چھٹن! میں یہ کیا سُنتی ہوں؟ تم نے کس موئے خدائی
خوار کو سر چڑھا رکھا ہے؟"۔

نواب چھٹن کچھ دیر تو سر نہوڑائے کھڑے رہے۔ پھر بولے "میں کیا
کروں؟ اس کمبخت کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ میری جان بچائی ہے اُس نے

خورشید لقا بیگم تنک کر بولیں "جان بچائی ہے۔ تو کچھ دے دلا کے رخصت کرو۔ ایسے لچے شہدوں سے یوں ربط ضبط بڑھانا، بھائی اور دوست بنانا ٹھیک نہیں"

نواب چھٹن نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور دیوان خانہ میں آگئے۔

---

دوسرے دن نواب چھٹن کے ہاں ایک پُر تکلف ضیافت کا انتظام تھا شہر بھر کے رئیس اور اعلیٰ عہدہ دار مدعو تھے۔ کچھ مہمان آچکے تھے۔ کچھ آرہے تھے۔ کہ نواب چھٹن اپنے دوست سر افتخار علی کے ساتھ باتیں کرتے کرتے باغ کی طرف نکلے۔ اتنے میں کسی نے پکارا "چھٹن"۔ نواب صاحب گھبرا گئے۔ نظر اُٹھا کے دیکھا۔ تو سامنے دو چھوٹے چھوٹے لڑکے نظر آئے۔ ان میں سے ایک نے صرف غرارہ باندھ رکھی تھی۔ دوسرا صرف کرتا پہنے ہوئے تھا ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک ٹوکری سی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ آگے بڑھے۔ اور ان میں سے ایک کہنے لگا "تم میں سے نواب چھٹن کس کا نام ہے؟"

نواب نے آگے بڑھ کر کہا "میں ہوں"

لڑکا بولا "اچھا تو تم ہو۔ وہ نواب جسے میرے ابّا نے نہر سے نکالا تھا۔ ہم دونوں بھائی تمہیں دیکھنے آئے ہیں۔ ابّا نے سنگتروں کا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔ اور یہ ٹوکری واپس بھیجی ہے۔"

سر افتخار علی کہنے لگے "یہ عجیب واقعہ ہے۔"

نواب چھٹن بولے "ہاں بھائی بات یہ ہے۔ میں پرسوں رات نہر میں گر پڑا تھا۔"

لڑکا بیچ میں بول اٹھا "اور تم شراب کے نشہ میں تھے۔"

---

اُن دنوں خورشید لقا بیگم کو نواب چھٹن کے بیاہ کی بہت فکر تھی۔ بہتیرے پیغام آئے۔ لیکن نواب چھٹن نے کوئی رشتہ پسند نہ کیا۔ دراصل وہ مسٹر لطیف احمد بیرسٹر کی صاحب زادی زہرہ لطیف سے بیاہ رچانے کی فکر میں تھے۔ لڑکی ایک تو بڑی حسین دوسرے اس نے پڑھنے لکھنے میں مردوں کے کان کاٹے تھے۔ نواب کی خالہ کو اس رشتہ پر اگر کوئی اعتراض تھا۔ تو صرف یہ کہ زہرہ لطیف پردہ نہیں کرتی تھی۔ لیکن نواب نے منت خوشامد کر کے خالہ کو رضامند کر لیا۔ ایک شام کا ذکر ہے۔ نواب چھٹن زہرہ

کو سینما دکھانے لے گئے۔ پکے پل کے قریب ان کی موٹر کوئی لمحہ بھر کے لئے رُکی تھی۔ کہ آواز آئی "ذرا ٹھہرے رہیئے۔ میں آیا" نواب چھٹن نے دیکھا کہ شیخ شبراتی سر پر انڈوں کی ٹوکری اٹھائے بغل میں مرغیاں دابے چلے آ رہے تھے۔ کم بخت آتے ہی موٹر کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اور کہنے لگا "یار تمہیں تکلیف تو ہوگی۔ لیکن جُمّن بھٹیارے کے ہاں یہ مرغیاں اور انڈے پہنچانا ہیں۔ مجھے اگلے نکڑ پہ اتار دیجیو۔ اور دوست یہ نیک بخت کون ہیں؟ آداب عرض کرتا ہوں۔ مزاج اچھے ہیں آپ کے؟"

"نواب پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ لیکن بچارا کہے تو کیا کہے۔ اتنے میں اگلا نکڑ آیا۔ اور شیخ شبراتی آداب عرض کر کے رخصت ہوا۔ ادھر راستہ بھر زہرہ لطیف نے نواب سے بات تک نہیں کی۔ نواب نے بہتیرا کہا "بات یہ ہے بات یہ ہے" لیکن بے سود۔ سینما میں بھی وقت بڑی بے لطفی سے کٹا۔ دوسرے دن زہرہ نے لکھ بھیجا۔ کہ میں آپ سے راہ و رسم بڑھانا نہیں چاہتی۔

---

بیگم خورشید لقا کو معلوم ہوا۔ تو وہ بہت بگڑیں۔ اور نواب چھٹن سے کہنے لگیں "تم نے خاندان کی عزت خاک میں ملادی۔ میں اب اس کمبخت سے

پیچھا چھڑانے کی کوئی تدبیر کرتی ہوں۔"

یہ کہہ کر داروغہ کو بلوایا۔ اور اس نے شیخ شبراتی کے نام اس مضمون کا خط لکھوایا۔ کہ تم نے نواب چھٹن کی جان بچائی ہے۔ اس لئے ڈیڑھ ہزار روپیہ کی رقم معاوضہ کے طور پر تمہاری نذر کی جاتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آئندہ نیلی کوٹھی میں قدم نہ رکھو کیوں کہ نواب چھٹن تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔ خط کے ساتھ ڈیڑھ ہزار روپے کا چیک تھا۔

دوسرے دن نواب چھٹن چھتا مل بزاز کی دوکان سے کچھ کپڑے خرید رہے تھے۔ کہ شیخ شبراتی نے آلیا۔ اور کہنے لگا۔ "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سامنے چائے کی دوکان ہے۔ وہاں پانچ منٹ کے لئے چل بیٹھو۔"

نواب نے کہا "لیکن بات یہ ہے۔ کہ"

شیخ شبراتی نے بات کاٹ کر کہا "اچھا یہیں بات کرلیتا ہوں۔ آج مجھے ایک خط ملا ہے۔ تمہاری اس بڑھیا خالہ نے لکھوایا ہوگا۔"

نواب کی زبان سے صرف اتنا نکلا "دیکھو۔ دیکھو۔"

شبراتی نے جواب دیا "دیکھوں کیا۔ اس نے مجھے ڈیڑھ ہزار روپیہ کا چیک بھیجا ہے۔ میں روپیہ کا بھوکا تو نہیں۔ مگر اس خیال سے قبول کرلیا کہ تمہاری

دل شکنی نہ ہو۔ ہاں تو خط میں لکھا ہے۔ کہ نواب تم سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا میں پوچھتا ہوں۔ یہ کیا حرکت ہے؟ میں نے تم سے کیا برائی کی؟"

نواب نے کہا "قسم ہے قسم ہے۔ جناب امیر کی"

شیخ شبراتی گرج کر بولا "یہی ہے میرے احسان کا بدلہ۔ اگر میں اس رات جان پر کھیل کے تمہیں نہر سے نہ نکالتا۔ تو آج تم کہاں ہوتے۔ ارے مجھ ایسے دوست سے تمہارا یہ سلوک ہے۔ مجھ ایسے دوست سے جس نے تمہاری جان بچائی۔ میں تو تمہیں دوست سمجھتا تھا جگری دوست"

اتنے میں لوگ جمع ہو گئے۔ نواب فضیحتے کے ڈر سے بولا "بھائی مجھے تو معلوم بھی نہیں۔ خالہ اماں نے مجھ سے پوچھے بغیر تمہیں خط لکھوا دیا"

یہ سن کر شیخ شبراتی کا غصہ دھیما ہوا۔ اور کہنے لگے "یہ تو مجھے بھی شبہ ہوا تھا۔ خیر اب اس قصہ کو جانے دو۔ آؤ چل کے چائے پئیں"

جمن بھٹیارا آج تک ہر گاہک سے کہتا ہے۔ کہ میرے ہاں نواب چھٹن اکثر چائے پینے آتے رہے ہیں۔

---

نواب آٹھ دن تک گھر سے باہر نہیں نکلے خورشید لقا بیگم بھی اٹوانٹی

کھٹوانٹی لیے پڑی رہیں۔ نویں دن نواب ٹہلتے ٹہلتے پھاٹک تک آئے کہ سامنے سے آواز آئی "نواب صاحب"

سڑک کے اُس پار ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے سامنے شیخ شبراتی کے دونوں صاحبزادے کھڑے تھے۔ اتنے میں شبراتی کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے دونوں لڑکوں کو ایک ایک چانٹا رسید کیا۔ اور نواب کے قریب پہنچ کر کہنے لگا۔ "یہ مکان مدت سے بکاؤ تھا۔ تم نے جو ڈیڑھ ہزار روپیہ بھیجا۔ تو میں نے سوچا۔ کہ مکان ہی کیوں نہ خرید لوں؟ اب تمہارے پڑوسی ہیں ہم۔ آؤ نواب۔ تمہیں مکان دکھاؤں"

نواب نے سر کھجایا "پھر کبھی سہی"

رات کو نواب چھٹن خورشید لقا بیگم سے کہنے لگے "خالا ماں! آپ نے شیخ شبراتی سے خوب پیچھا چھڑایا۔ اُس ڈیڑھ ہزار روپے سے شیخ صاحب نے ہمارے پڑوس میں ایک مکان خرید لیا ہے اب رات دن میرے سر پر مسلط رہینگے۔

۲۳ جون ۱۹۲۷ء کی رات کو نہر کے پاس ایک ٹولی پڑی پائی گئی تھوڑی دیر میں پولیس والے نیلی کوٹھی کے نواب چھٹن کو نہر سے کھینچ کنارے لے آئے بچارے نواب میں صرف ایک رمق جان باقی رہ گئی تھی۔

اب کے نہر کے کنارے کوئی کیلے کا چھلکا بھی نہیں تھا۔

# شیخ جعفر حلّاج کیسے لیڈر بنا

اگر آپ جاننا چاہتے ہیں۔ کہ لیڈری کی شاخ زعفران بندہ کے ہاتھ کیسے آئی۔ تو سینے عرض کرتا ہوں۔

آج سے چار سال اُدھر میں دُھینے کا پیشہ کرتا تھا۔ دن بھر روئی دُھنکنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ کبھی صرف دو قران[1] ہاتھ آتے تھے بہت ہوا۔ تو دس قران کما لئے۔ شام ہوئی۔ دکان بند کی۔ اور گوشت روٹی لے کر گھر پہنچا۔ لیکن میری جورو۔ عورت ذات۔ ناقص العقل۔ اُس سے روز فاقا کل کل رہتی۔ مارے طعنوں کے ناک میں دم کر دیا۔ اکثر کہا کرتی تھی۔

روز یونہی جا کے فندک فندک کیا کر۔ آٹھ پہر روئی دُھنکنا اور رات کو گھر آجانا۔ اے سبحان اللہ کیا زندگی ہے۔ ذرا دیکھ تو ہمارا پڑوسی حاجی علی سال بھر پہلے ہماری طرح کنگلا تھا۔ اب آدمیوں میں شمار ہونے لگا ہے بھلے مانسوں سے میل ملاپ

[1] قران ایرانی سکے کا نام ہے۔

کی پینگ بڑھا رکھی ہے۔ اور اُسکی بیوی تو کہتی ہے۔ کہ وہ کچھ دلوں میں پارلیمینٹ کا ممبر بننے والا ہے۔ ہزار قران تنخواہ، اور عزت گھاتے ہیں لیکن تیری نگوڑ ماری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ مرتے دم تک روئی دھنکے۔ اور رات کو لون تیل لیکر گھر آجایا کرے"۔

اصل میں بی گھر لسی کو اس طرح ملامت کرنے کا حق بھی تھا۔ حاجی علی کمبخت ہونق۔ صورت نہ شکل، مدتوں کتے کی طرح مارا مارا پھرا۔ آخر چھل چھلا کے آدمی بنا۔ اخباروں میں نام چھپنے لگا۔ لیڈر اور جمہوریت پسند مشہور ہوا۔ اور لوگ کہنے لگے۔ کہ کوئی دن میں حاجی علی بادشاہ اور وزیر کے ساتھ اُٹھا بیٹھا کرے گا"۔

سچ پوچھیے۔ تو میں خود بھی اس روز روز کی فندک فندک سے تنگ آگیا تھا۔ ایک رات میری منہ پھٹ بیوی نے شرم و حیا کی چادر بالکل اُتار ڈالی۔ اور اِس طرح بکنا شروع کیا۔ کہ بس حد ہوگئی میں نے اُس رات تہیہ کرلیا۔ کہ اب جو ہو سو ہو۔ روئی دھنکنا چھوڑ چھاڑ حاجی علی کے ڈھرے پر چل نکلے۔ اتفاق سے اِنہیں دلوں میری قسمت کے ستارے نے آنکھ کھولی۔ اور قدرت نے میری مرضی کے مطابق سامان

مہیا کر دیا۔

ہوا یوں۔ کہ ایک دن بازاروں میں شور مچ گیا۔ "ارے بھائیو۔ دکانیں بڑھاؤ۔ اور پارلیمنٹ میں جمع ہو جاؤ"۔

اُونگھنے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ میں تو گدھے کی طرح اس انتظار میں کھڑا تھا۔ کہ کب کوئی منخارے۔ اور میں قدم بڑھاؤں بجلی کی طرح چمک کر اُٹھا دکان بند کی۔ اور بازار میں شور مچا مچا آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ یہ تو میں بارہا دیکھ چکا تھا۔ کہ ایسے موقعوں پر یار لوگ کیا کیا کہا کرتے ہیں۔ میں نے بھی اُن کی طرح فیل لانا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ اب اُس کیفیت کو لفظوں میں کیسے بیان کروں۔ اُس وقت میری حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ میں چلا چلا کے کہہ رہا تھا:۔

"اے باغیرت ایرانی۔ وطن تیرے ہاتھ سے نکل گیا۔ کب تک یونہی خاک اُڑاتا پھرے گا۔ اتفاق، اتحاد۔ برادری۔ آؤ بھائیو آج فیصلہ ہی چکا دیں۔ مارے گئے تو زندگی جاوید ہاتھ آئیگی۔ اور زندہ رہے تو اس ذلّت اور بے شرمی کی زندگی سے نجات مل جائے گی۔ یا اللہ غیرت، یا اللہ رحمت" ایک شخص بولا:

جب تک ہم سے انصاف نہیں ہوتا۔ دکانیں بند رہیں"۔
دوسرا کہنے لگا "جب تک اس پارلیمنٹ کے ظلم کا ٹھینگا
ہمارے سر پر ہے۔ بازار نہ کھلے"۔

مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ یہ سب میری ہاؤ ہُو کا نتیجہ ہے بس پھر کیا تھا۔ کلیجہ چار ہاتھ کا ہو گیا۔ اس طرح بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے اور لفظوں کی چٹانیں لڑھکانے لگا۔ کہ بعد میں اپنی ان باتوں پر غور کیا۔ تو تعجب ہوتا تھا۔ خاص طور پر جب میں نے کہا۔ کہ اگر بادشاہ ہماری مدد نہ کرے۔ تو اُسے تخت سے اُتار دو۔ تو لوگوں پر بے حد اثر ہوا۔

اب ہر طرف سے دوست آشنا دوڑ پڑے اور کہنے لگے۔ کہ شیخ جعفر بھلے آدمی یہ کیا؟ خدا تجھ پر رحم کرے۔ گھاس کھا گیا ہے۔ کیا۔ ذرا سوچ تو سہی کہ تو کیا بک رہا ہے؟ تو غریب دُھنیا۔ تجھے ان فضول جھگڑوں سے کیا واسطہ۔ بھلے مانس عقل کے ناخن لے۔ لیکن حضرت سلامت وطن کی محبت کا نشہ ایسا تھوڑے ہی تھا۔ کہ ان باتوں سے اُتر جاتا۔ میں نے ایک ہانک جو لگائی۔ تو سارے بازار گونج اُٹھے۔ میری آواز کے سامنے قفلی بیچنے والے کی آواز گرد تھی۔ اب آہستہ آہستہ دنیا بھر کے خدائی خوار۔ چپڑ قناتی میرے گرد

جمع ہونے لگے، مجھے یہ فوج جو ہاتھ آئی۔ تو مست اونٹ کیطرح جھومتا جھامتا پارلیمنٹ کیطرف چل پڑا۔ راستہ میں اور لوگ آ آ کے ملتے جاتے تھے۔

پارلیمنٹ کے دروازے پر پہنچے تو کوئی ہزار آدمی میرے پیچھے تھے پارلیمنٹ کے سامنے ایک سپاہی نے آکر روکا۔ پہلے سوچا کہ اسے ذرا دھمکا کے ہٹا دیئے اور پارلیمنٹ میں گھس جایئے لیکن وہ بڑا تجربہ کار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس پہ طرہ یہ کہ قوم کا ترک۔ فارسی زبان سے ناآشنا۔ پھر مجھے اس کی کمر میں کارتوسوں کی پیٹی بھی نظر آئی۔ چنانچہ میں نے لوگوں کیطرف رُخ کر کے کہا۔ کہ بھائیو! قانون کا احترام ضروری ہے اس لئے ہم میں سے پہلے ایک شخص پارلیمنٹ کے ممبروں کے پاس جائے۔ اور اُن سے کہے کہ فلاں شخص ایک لاکھ آدمی لے کر دادخواہی کی غرض سے آیا ہے۔ وقت آگیا ہے۔ کہ بہادر اور غیور ایرانیوں کے نمایندے اپنا فرض ادا کریں۔ ورنہ قوم جان دینے کے لئے طیار ہے کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی۔ تو میں ذمہ دار نہیں۔ قوم میرے روکے نہیں رُکے گی۔ فوراً ایک نوجوان جو پارلیمنٹ کا چپڑاسی معلوم ہوتا تھا۔ آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ کہیں آپ کا پیغام پہنچاتا ہوں۔ وہ کچھ دیر کے بعد واپس آیا۔ اور کہنے لگا کہ جناب آقا شیخ جعفر کی طلبی ہے۔

میں بڑے غرور سے جھومتا جھامتا اینڈتا بڑتا اندر پہنچا لیکن راستہ میں سوچتا جاتا تھا۔ کہ اگر وہاں کسی نے پوچھ لیا۔ کہ تمہارے مطالبات کیا ہیں تو میں کیا جواب دونگا۔ میں اس چپراسی سے جو مجھے راستہ بتاتا جاتا تھا۔ پوچھنے کو تھا۔ کہ بھائی یہ جھگڑا کاہے کا ہے اور لوگوں نے ہڑتال کیوں کر رکھی ہے۔ لیکن موقع نہ ملا۔ اور میں نے یکبارگی اپنے آپ کو ممبروں کے سامنے پایا۔ اُس وقت میرا عجب حال تھا۔ مارے گھبراہٹ کے ایک پاؤں سے جوتی نکل گئی۔ میں نے ایسا اجتماع اور اس قسم کا شاہانہ ٹھاٹھ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہر طرف کالر ہی کالر۔ بیچ بیچ میں عمامے بھی نظر آجاتے تھے۔ سب کے سب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ میں ایک اونچی سی جگہ بنی تھی، جس پر چند معزز آدمی بیٹھے تھے۔ اُن سے اُتر کے دو تین آدمی قلم ہاتھوں میں لئے فرشتوں کی طرح نامۂ اعمال میں عذاب ثواب کا حساب لکھتے اور کاغذ پر کاغذ سیاہ کرتے جا رہے تھے۔ ایک بڈھے کالر والے نے جو پہلی قطار میں بیٹھا تھا۔ میری طرف رُخ کر کے کہا

"جناب حاجی شیخ جعفر! حکومت اِس کوشش میں ہے کہ قوم کی خواہش کے مطابق سارے کام انجام پائیں۔ اُمید ہے

کہ ہمیں اس کوشش میں کامیابی ہوگی۔ آپ قومی حقوق کے علمبردار ہیں۔ اسلئے ہم چاہتے ہیں۔ کہ آپ قوم کو دلاسا دے کر خاموش کرا دیجئے۔ اور ہماری طرف سے یقین دلا دیجئے۔ کہ لوگ جو کچھ چاہتے ہیں وہی ہو کے رہیگا"۔

اس کے بعد بعض دوسرے لوگوں نے بھی اُلٹی سیدھی باتیں کیں لیکن میری سمجھ میں صرف اتنا آیا۔ کہ بُڈھا کالروالا جس نے پہلے تقریر کی تھی۔ وزیراعظم تھا۔ باقی سب بڑے بڑے سروں والے جمہوریت پسند، اعتدالی ایلم غلم اور خدا جانے کیا کیا۔ میں پارلیمنٹ سے نکلا تو خیال تھا۔ کہ لوگوں کے سامنے لمبی چوڑی تقریر کردوں۔ اور اُنہی باتوں کو تھوڑے سے اُلٹ پھیر کے ساتھ اپنی گڑھنت بنا کے لوگوں کو سنا دوں لیکن لوگ منتشر ہو کر اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔ میں بھی گھر کی طرف چل پڑا۔ کہ جلد پہنچ کے بیوی کو یہ خبر سناؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس وقت طرح طرح کے فکروں اور خیالوں میں مستغرق تھا۔ اور اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ کہ بلا سے آج رات بیوی بچے بھوکے ہیں۔ ہم لیڈر تو ہو گئے +

میرے گھر پہنچنے سے پہلے میری شجاعت کے چرچے وہاں پہنچ چکے تھے

دروازے میں قدم ہی رکھا تھا۔ کہ حسنی کی اماں خوش خوش لینے کو بڑھی آج وہ بڑی مہربانی سے پیش آئی۔ اور کہنے لگی۔ شاباش۔ اب تم نے انسانوں میں قدم رکھا۔ کل تک کسی شمار و قطار میں نہیں تھے۔ آج بادشاہ اور وزیر سے ٹکراتے اور بلبل کیطرح چہکتے ہو۔ مرحبا، ہزار آفرین۔ اب تو مارے جلاپے کے حاجی علی کی بیوی کی چھاتی پھٹ جائیگی ✦

میری بیوی سمجھے بیٹھی تھی۔ کہ اُس کا میاں سچ مچ تیس مار خاں بن گیا ہے۔ میں نے بھی پاؤں پھیلائے اور اکڑ کے کہا "جب ہمارے سر پر بادشاہ کا سایہ موجود ہے تو کیا وجہ ہے کہ قوم کی اُمیدیں پوری نہ ہوں"۔ غرض میں نے پارلیمنٹ میں جو اینڈی بینڈی باتیں سُنی تھیں۔ وہ بیوی کے سامنے اس طرح دہرائیں۔ کہ وہ بچاری بھی غچا کھا گئی ✦

دوسرے دن سارے اخباروں میں یہ واقعہ تفصیل سے چھپ گیا اخباروں نے میرے جوش و خروش کو قومی احساس کا نتیجہ قرار دیا۔ اخبار "حقیقت" کا نمایندہ انٹرویو کے لئے آیا۔ اور کئی اُلٹے سیدھے سوال کئے۔ جن کا مطلب میں خاک بھی نہ سمجھا۔ اس سے بھی زیادہ مزے کی بات سُنئے۔ ایک فرنگی میری تصویر کھینچنے آیا۔ میری بیوی نے اُس کے خوب لتے لئے اور سینکڑوں

صلواتیں سُنا کے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ غرض میری لیڈری کی پہلی نشانی یہ تھی کہ اخباروں کا تانتا بندھ گیا۔ بس جب دیکھیے اخبار پر اخبار چلا آرہا ہے کوئی لقب ایسا نہیں تھا۔ جو اِن اخبار والوں نے مجھے نہ دیا ہو۔ "قوم کا سچا رہنما۔ وطن پرستوں کا بادا فدائے ملک و ملت"۔ افسوس کہ میری بیوی اچھی طرح ان کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ اور میری سمجھ بھی بیوی کی سمجھ سے کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔

اُسی دن ظہر سے کچھ پہلے حاجی علی مجھ سے ملنے آیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ میں نے حُقّہ بھر کے اُس کے سامنے رکھا۔ اور کہا فرمایئے حاجی علی دم لگا کے بولا۔ بھائی معلوم ہوتا ہے کہ میری بیماری تمہیں بھی لگ گئی یعنی تم بھی جھونپڑے میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنے لگے۔ اگرچہ ہم پیشہ ہمیشہ ہم پیشہ کا دشمن ہوتا ہے لیکن عقلمند آدمی کو بڑا دل گردے والا ہونا چاہیئے۔ ہاں تو مجھے کہنا یہ ہے۔ کہ اگر کل تم آن کی آن میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ لیکن میں اِس راستہ کے اُتار چڑھاؤ سے زیادہ واقف اور تم سے زیادہ تجربہ کار ہوں۔ اس لیئے بہتر ہے کہ ہماری تمہاری سانٹھ گانٹھ ہو جائے۔ البتہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ اور اِن سیاسی بکھیڑوں میں اس طرح کی اِٹ سِٹ کے سوا کام ہی نہیں چلتا۔ تم سمجھے ہو گے۔ کہ

تم نے شور مچا کے اور وزیرِ اعظم اور پارلیمنٹ کا مقابلہ کر کے بڑا میدان مارا۔ اب یاروں کے مزے ہیں۔ لیکن کچھ لسبنت کی بھی خبر ہے۔ یار لوگ جو گھات میں لگے ہیں تمہیں کب چھوڑتے ہیں۔ کل ہی جھوٹ اور بہتان کے دونگڑے نہ برسنے لگیں۔ بیوی پہ طلاق نہ پڑ جائے۔ حقہ پانی بند نہ ہو جائے۔ گشتنی اور گردن زدنی نہ کہلاؤ تو سہی ٭

یہ کہہ کے حاجی علی نے ایک دم جو لگایا۔ تو اُس کے نتھنوں سے دھواں نکلنے لگا۔ اگرچہ میں اُسکی باتوں کا مطلب تو نہیں سمجھا۔ لیکن بہرحال اتنا معلوم ہو گیا۔ کہ وہ بڑا کائیاں اور تجربہ کار آدمی ہے۔ چنانچہ میں نے کہا۔ آپ جو کہیں گے بسر و چشم بجا لاؤں گا۔ بڑی حیص بیص کے بعد یہ طے ہوا۔ کہ میں اُسے ممبری دلوانے کے لیئے بازار میں اُس کا پروپیگنڈا کروں۔ اور وہ مجھے لیڈری کے داؤ پیچ سکھلائے ٭

اب حاجی علی نے نصیحتوں کا دفتر کھولا۔ اور ایسی ایسی باتیں کہیں۔ جو میں نے پہلے کبھی نہ سُنی تھیں۔ پھر بہت دیر تک سمجھا سمجھا کے بولا۔ کہ "تو اب سیاست کے پہلے زینہ پر قدم رکھا" جب وہ چلنے کو ہُوا۔ تو کہنے لگا کہ پھر کہاں اور کب "جلسہ" ہوگا۔ میں نے یہ لفظ اس سے پہلے نہیں

سُنا تھا۔ جواب کیا دیتا۔ حاجی ایک ہی نٹ کھٹ، تانت باجی اور راگ بُوجھا۔ فوراً سمجھ گیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ یہ لیڈروں کی خاص زبان ہے۔ جس سے تم آہستہ آہستہ واقف ہو جاؤ گے۔ ارے بھائی "جلسہ" ملاقات کو کہتے ہیں۔ عام لوگ ایک دوسرے سے کہا کرتے ہیں "پھر کب ملئے گا۔ کب ملاقات ہو گی"۔ لیکن لیڈر لوگ ایسے موقع پر پھر کب "جلسہ" ہو گا کہتے ہیں۔

---

حاجی علی ہر "جلسہ" میں مجھے اس زبان کے چند الفاظ یاد کرا دیا کرتا تھا۔ اُس دن بھی اُس نے مجھے بہت سے الفاظ سکھائے جن میں سے بعض ابھی تک مجھے یاد ہیں۔ حرّیت یعنی آزادی مساوات یعنی ہمسری۔ کانٹی ٹیوشن یعنی ..... یعنی ..... خدا جانے کیا ..... بھول گیا۔ ..... زندہ باد یعنی خدا اُسے زندہ رکھے +

حاجی علی گیا۔ تو میں نے ہاتھ دھو کپڑے ڈانٹ بیوی سے کہا۔ کہ آج جلسہ ہے"۔ پھر باہر نکلا۔ کہ بازار چلکے دنیا کا رنگ ڈھنگ دیکھیں لیکن گھر سے قدم باہر رکھا ہی تھا۔ کہ اغل بغل سے کنجڑے، قصاب، اساطی

بساطی دوڑ پڑے اور جھک جھک کے سلام کرنے لگے۔ اُن کے تیوروں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ میری عظمت کا شہرہ اِن کے کانوں تک پہنچ چکا ہے اور کچھ نہیں تو دس پندرہ دن قرض وام کر کے زندگی بسر ہو سکتی ہے اِس پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی "۔ زندہ باد۔ قوم کے رہنما شیخ جعفر روٹی پھینکنے والے کچھ لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ آگے پیچھے دہنے بائیں لوگ ہی لوگ۔ پہلے تو میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے۔ پھر شکائتیں شروع ہوئیں۔ ایک بولا کہ مجھے "فلاں السلطنتہ" نے گھر سے نکال باہر کیا اور ساری جائداد چھین لی۔ دوسرا کہنے لگا۔ کہ فلاں عالم نے مجھے ڈرا دھمکا بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کیا۔ عورت قبول صورت تھی۔ ایسے ریجھے کہ خود اُس سے بیاہ کر لیا۔ غرض بازار پہنچتے پہنچتے یہ حال ہوا۔ کہ طہران میں سو سال کے اندر جتنے مقدمے ہوئے تھے۔ لوگوں نے سب میرے سامنے پیش کر دیئے میں بھی وعدہ کرنے میں برق سب کو دم دلاسا دیتا۔ اور خدا آپکی عمر دراز کرے۔ خدا آپ کے دشمنوں کو ذلیل کرے "۔ اِس قسم کی دعائیں لیتا آگے بڑھا۔

بازار پہنچا۔ تو لیڈروں کی طرح بخندہ پیشانی سلام لیتے اور جواب دیتے

قدم بڑھایا۔ لوگوں نے پوچھا۔ کہ جناب شیخ۔ کوئی تازہ خبر؟ میں نے بھی اس انداز میں گویا ایران کے وزارت خانہ کے تار کا سرا میرے کمرے سے ملا ہوا ہے۔ ٹیلیفون پر پل پل کی خبریں پہنچتی ہیں۔ مختصر جواب دینے شروع کئے۔ جواب کیا تھے۔ پہیلیاں تھیں۔ مثلاً خدا رحم کرے۔ ایسی خراب حالت بھی نہیں۔ ہمیں تو بڑی بڑی اُمیدیں ہیں۔ حالات سازگار ہیں۔"

میں اپنی دوکان کے سامنے پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ کہ کیا کروں۔ جیب بالکل خالی۔ پھنجھی کوڑی تک پاس نہ تھی۔ پہلے سوچا کہ دکان کھول کر کام شروع کروں۔ لیکن اب روٹی دھنکنا میری شان اور مرتبہ کے خلاف تھا۔ میں انہیں فکروں اور خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ سلام علیکم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک شخص میرے سامنے کھڑا ہے۔ لیکن آدمی کا ہیے کو تھا۔ گدا معلوم ہوتا تھا۔ ظالم کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ جیسے عضو عضو میں کمانیاں لگی ہوں۔ وہ کہے جا رہا تھا۔ "میں آپ کا خانہ زاد غلام۔ آپ کے قدموں کی خاک ہوں۔" کمبخت نے بات کرنا دشوار کر دیا۔ اُس کی گردن کبھی جھکتی تھی کبھی بلند ہوتی تھی کبھی میرے پیچھے تھا کبھی آگے۔ کبھی سینہ پر ہاتھ رکھتا کبھی آنکھوں پر۔ اور کبھی سر پر۔ اور ہنس

ہنس کر اور سر اور گردن ہلا ہلا کر مجھے اور میری اولاد کو دعائیں دیتا تھا۔ میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ اور گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ دعائیں دیتا سایہ کی طرح ساتھ لگا آتا تھا۔ میں نے گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہوا۔ سوچا۔ کہ شکر ہے۔ اس کمبخت کے ہاتھ سے نجات پائی۔ لیکن نجات کہاں۔ وہ بھی کھٹ سے اندر پہنچا۔ اور کہنے لگا۔ اب اطمینان سے باتیں ہو سکتی ہیں۔ مجھ میں اب ضبط کی طاقت باقی نہ رہی تھی۔ چلّا کے کہا۔ کہ تو نے کوّے کا مغز کھا رکھا ہے کیا؟ کیا مُرٹر لگائی ہے۔ دو گھنٹے سے دماغ چاٹ رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تجھے کس سے کام ہے اور مجھ سے کیا چاہتا ہے؟

اُس نے جب دیکھا۔ کہ رنگ نہیں جمتا۔ تو ایک رد کا پھیکا قہقہہ لگا کر بولا۔ کہ خدا نہ کرے میری وجہ سے آپ کی طبیعت مکدر ہو۔ قسم ہے کہ مجھے آپ سے بڑی عقیدت ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ دل کی بات کیسے کہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے ردیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی نکالی۔ اور میرے حوالے کر کے بولا۔ خاقان السلطنتہ نے غفور السلطنتہ کی مخالفت پر کمر باندھی ہے۔ وہ چاہتے ہیں۔ کہ اُسے گرانے کے لئے پروپیگنڈا کریں آپ

نام اُن کے کانوں تک پہنچ چکا ہے۔ اس لیئے اُن کی خواہش ہے کہ آپ اِس معاملہ میں اُن کا ساتھ دیں۔ یہ کہا اور جھپاک سے باہر +

میں نے دل میں کہا۔ بارک اللہ سچ مچ اب میرا شمار اِلنسانوں میں ہونے لگا ہے! اس خیال کے آتے ہی میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اتفاقاً روپوں کی تھیلی ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا پڑی۔ اور انگنائی کی پکی اینٹوں پر پڑ کر پھٹ گئی۔ اُس میں سو کے قریب دو ہزاری سکّے تھے۔ میں اُنہیں اُٹھانے نہ پایا۔ کہ دروازہ کھُلا۔ اور حاجی علی کا سر نظر آیا۔ دو ہزاری پر نظر پڑتے ہی وہ ایک زہر خند کے ساتھ بولا۔ اخّاہ! اب تو تمہارے گھر میں پُرانے لحافوں کی روئی کے بجائے چاندی کے سکّے برستے ہیں۔" میں اُسے کوئی حیلہ حوالہ کر کے ٹالنا چاہتا تھا۔ لیکن جی نہ چاہا۔ کہ میں نے جو شہرت اور عزّت پائی ہے۔ اُسے حاجی علی سے چھپاؤں اس لیئے اُس سے کہا۔ تم سے بھائی چارہ کر چکا ہوں۔ تم سے کیا پردہ ہے یہ کہہ کر میں نے خوب نون مرچ لگا کے اور بڑھا چڑھا کے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ اور کہا کہ اب تمہاری سمجھ میں جو کچھ آتا ہے کہو۔ تمہارے حکم سے سرتابی نہیں کروں گا +

حاجی علی نے سر ہلا کے کہا "خوب معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم نے اپنا رنگ جما لیا۔ لیکن ایک بات کہے دیتا ہوں۔ کان کھول کے سنو۔ میں جو کچھ کہوں گا۔ لگی لپٹی رکھے بغیر برادری کا حق ادا کرنے کے لئے حاجی شیخ جعفر جس طرح دوسرے کاموں میں سرمایہ ضروری ہے اسی طرح لیڈری میں بھی سرمایہ کے بغیر کام نہیں چلتا +

میں نے بات کاٹ کے کہا۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ لیڈر کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیئے +

حاجی نے مسکرا کے جواب دیا: تعلیم لیڈر کے کس کام کی؟ لیڈر کو مکتب تھوڑے ہی کھولنا ہے میں نے کہا تو پھر یوں کہو کہ دفتر کے کام کاج کا سلیقہ ہونا چاہیئے:۔ وہ بولا۔ بھائی خدا تجھے نیکی دے۔ دفتر کے کام کاج کو کوئی کیا کرے؟ لیڈر کو کلرک بن کر دفتر میں قلم گھسانا تو ہے نہیں؟

میں نے کہا:۔ یہ بھی نہیں۔ تو تمہارے خیال میں لیڈر کے لئے مکّہ کربلا اور مشہد کی زیارت کرنا ضروری ہوگا +

حاجی علی کہنے لگا۔ بھائی تعلیم، تقدّس اور دفتری کاروبار کا سلیقہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ لیڈری کے لئے تو صرف نیک چلنی شرط ہے۔

اِس دو کان کا سرمایہ یہی ہے ۔

میں نے کہا :- نیک چلنی کے معنی یہ ہیں ۔ کہ پرائی بہو بیٹیوں کو نہ تاکتا پھرے ۔ خیانت نہ کرے ۔

وہ بولا :- اِن باتوں کو نیک چلنی سے کیا تعلق ۔ لیڈر کی نیک چلنی یہ ہے ۔ کہ رشوت نہ لے ۔

میں نے کہا :- "رشوت وہی ہے نا ۔ جو مُلّا لوگوں کو دی جاتی ہے ؟"

اُس نے جواب دیا :- ہاں ۔ اگلے وقتوں میں لوگ فقیر فقرا، امیروں وزیروں پیروں اور مُلّاؤں کو رشوت دیتے تھے ۔ لیکن پارلیمنٹ نے کایا ہی پلٹ دی اب امیر، وزیر، صُوبہ دار اپنے سے ادنےٰ درجہ کے لوگوں کو رشوت دیتے ہیں ۔

میں نے کہا :- یہ رشوت تو نہیں ۔ ایک قِسم کا صدقہ یا زکواۃ ہے اس میں حرج ہی کیا ہے ؟"

حاجی علی بولا :- بھائی ! صدقہ تو خدا کی راہ میں دیا جاتا ہے ۔ رشوت اور ہی چیز ہے ۔ پہلے یہ قاعدہ تھا ۔ کہ جو شخص کوئی عہدہ حاصل کرنا چاہتا تھا ہزار، دو ہزار، لاکھ دو لاکھ بادشاہ کی نذر کرتا تھا ۔ اور اُس کا کام بن جاتا تھا ۔

آج امیر وزیر اور بڑے بڑے سرکش لیڈروں کو رشوت دیتے ہیں۔ لیکن جو شخص نیا نیا لیڈر بنا ہو۔ اُسے رشوت نہیں لینا چاہیئے۔ ہاں جب لیڈری کے میدان میں قدم اچھی طرح جم جائیں۔ اور کچھ لوگ ساتھ دینے اور ہاں میں ہاں ملانے والے ہاتھ آجائیں۔ تو کوئی دھونگ رچاؤ۔ لیکن اس ترکیب کے ساتھ کہ کوئی نہ سمجھ سکے۔ اور تو اور بیوی بچے دھوکا کھا جائیں۔ رشوت لینے کا مزا جبھی ہے۔ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے +

حاجی علی کی باتیں میرے جی کو لگیں۔ اور یہ بات سمجھ میں آئی۔ کہ میں نے جھک ماری۔ کیا عجب کہ یہ خبر سارے شہر میں پھیل جائے۔ اور لوگ کہنے لگیں کہ حاجی شیخ جعفر امتحان میں پورا نہ اترا۔ روپیہ دیکھ کے پھسل گیا۔ اب ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں۔ کہیں یہ نہ ہو۔ جو تھوڑی بہت عزت حاصل کی ہے اس سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں۔ یہ سوچ کر میں گھر سے نکلا۔ اور پارلیمنٹ کا رُخ کیا۔ پارلیمنٹ کے سامنے پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ اور شور مچا ہوا ہے۔ میں اچھی طرح اس شور کی مد نہ سمجھا البتہ خیانت، پھانسی، اور قید اور اسی قسم کے دوسرے لفظ سنائی دیئے۔ تو یہ بات سمجھ میں آئی۔ کہ سیاسی شعبدہ بازوں نے پھر کسی بچارے کو نیچا دکھانے

کا منصوبہ باندھا ہے اور اُن کی انگیخت سے لوگ سر چڑھے جاتے ہیں۔
اتنے میں لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ اور ہر طرف سے سلام سلام کی آوازیں آنے
لگیں +

یکایک کسی نے کہا۔ کہ اب حاجی شیخ جعفر تقریر کریں گے۔ جب تک
میں سنبھلوں۔ لوگوں نے مجھے اُٹھا کے ایک اسٹول پر کھڑا کر دیا۔ لوگ منہ کھولے
مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ اور سب کے کان میری آواز پہ لگے
تھے۔ گویا سب منتظر تھے کہ اب دیکھیں آقا شیخ جعفر کے ہاتھوں غداروں
کی کیسی گت بنتی ہے؟ میں نے جوں توں کر کے وہی سات آٹھ باتیں جو
حاجی علی نے مجھے سکھا پڑھا دی تھیں۔ دہرائیں۔ غداروں کی دُم میں چند
گالیوں کا نمدا باندھا۔ انہیں قوم کے غیظ و غضب سے ڈرایا۔ پھر ایک قہقہہ لگا
کے کہا۔ اور سُنا۔ یہ لوگ روپے کی چاٹ سے مجھے غدار بنانے کی فکر میں ہیں
لیکن میں نے بھی ایسی ایسی بہت تھیلیاں دیکھی ہیں۔ یہ لوگ ہزار دو ہزار
سے میری نیت ڈانواں ڈول کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ حال ہے
کہ کروڑ بھی ہو۔ تو وطن پرستی کے راستے سے قدم نہ ہٹے۔"

اس موقع پر جی چاہتا تھا۔ کہ لیڈروں کے قاعدہ کے مطابق یورپ

والوں کی۔ وطن پرستی کے متعلق لوگوں کو کوئی حکایت سناؤں۔ لیکن میں ان باتوں میں کورا تھا۔ ابھی پرانے اُستادوں کے داؤں پیچ کہاں آتے تھے۔ اس لئے یہ خیال چھوڑ کر جیب سے وہی تھیلی جو "خاقان السلطنۃ" نے بھیجی تھی نکالی۔ ایک بے موقع شعر پڑھا۔ لوگ تالیاں بجا کے فارغ ہوئے تھے۔ کہ میں نے اپنے نوکر ہاشمی کو جو کھڑا زور سے تالیاں پیٹ رہا تھا۔ بلایا۔ اور پکار کے کہا کہ "لے یہ تھیلی اس کے مالک کو دے آ۔ اور ہاں اُس سے کہہ دیجیو۔ کہ تم نے مجھے کیا سمجھا ہے؟ وطن پرستوں کا مُنہ روپوں سے بند نہیں کیا جا سکتا۔" ہاشمی بڑھا۔ لیکن وہ ابھی یہ پوچھنے نہ پایا تھا۔ کہ تھیلی کو کیا کروں۔ اور کہاں لے جاؤں۔ کہ "زندہ باد شیخ جعفر اور پائندہ باد غیرتِ ملّی" کی صدا سے زمین و آسمان گونج اُٹھے۔ اور لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہوش بجا ہوئے۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو چکے ہیں۔ اور میں اکیلا کھڑا ہوں۔ میں نے پائپ پینا چاہا۔ لیکن جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہی لوگ جن کے نعروں کی صدا ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ پائپ اور تمباکو کی تھیلی اُڑا لے گئے ہیں۔"

ابھی میں اس صدمہ سے نہیں سنبھلا تھا۔ کہ ایک جانی پہچانی آواز کانوں میں آئی۔ نگاہ اُٹھائی۔ تو وہی چپڑاسی نظر آیا۔ جو خاقان السلطنۃ کے ہاں سے روپیہ لایا تھا۔ جی میں آیا۔ کہ اسے بے نقط سناؤں۔ اور اپنی قومی غیرت کی کتھا کہلاؤں۔ لیکن پھر سوچا کہ آس پاس کوئی آدمی تو ہے نہیں لوگ کبھی کے جا چکے ہیں۔ اس لئے بگڑنا اور جوش دکھانا بے موقع ہے اس چپڑاسی نے مجھے بات کرنے کی مہلت نہ دی۔ پہلے کہا۔ کہ خاقان السلطنۃ نے آپ کو بہت بہت سلام کہا ہے۔ پھر کہنے لگا۔ کہ آج میں نے آپ کی تقریر سنی۔ حضرت سلامت آپ نے تو قیامت برپا کر دی۔ لیکن آخر کچھ سوچ سمجھ کے ہی ایسی باتیں کہی ہونگی۔ اور سچ پوچھئے تو بڑی اُستادی سے کام لیا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ خاقان السلطنۃ آپ کی مہربانی سے جلد وزیر ہو جائیں گے۔ اور ہمیں بھی آپ کی جوتیوں کے صدقے کچھ مل رہے گا اور ہم سب آپکے سر کو ہمیشہ دعا دینگے۔ غرض وہ یونہیں بکتا جھکتا۔ خوشامد کرتا گھر تک میرے ساتھ آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ اس بے حیا سے کیسے مخلصی پاؤں۔ اس لیئے میں نے گھر میں گھستے ہی دروازہ بند کر لیا۔ اور اطمینان کا سانس لیا۔ اتنے میں بیوی کی آواز سنائی دی۔ کہ

آقا شیخ ذرا اِدھر تو آیئو۔ دیکھیو تمہارے کمبخت نوکر نے کیا گل کھلایا ہے تم نے جو روپے بھیجے تھے۔ اُس میں سے پندرہ قِران ڈبل اُڑا لیئے ہیں۔ پوچھتی ہوں تو کہتا ہے۔ کہ مہینہ بھر کی تنخواہ آپکے ذمّہ ہے۔ تم نے اس کے ہاتھ روپے بھیجے ہی کیوں۔ یہ تو وہی بات ہوئی۔ کہ بلّی چھیچھڑوں کی رکھوالی۔ تم اس بے حیا کو نہیں جانتے +

ہوا یہ کہ ہاشمی نے مجھ سے پارلیمنٹ کے سامنے روپوں کی تھیلی لی۔ تو اسکی سمجھ میں یہ نہ آیا۔ کہ کہاں لے جائے اور کسے دے۔ چنانچہ وہ اُسے گھر لے آیا۔ اور اپنی تنخواہ کے پندرہ قِران نکال لیئے۔ تقدیر یُونہی تھی۔ کہ یہ روپیہ ہر پھر کے گھر پہنچے، مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ بندہ کو دم مارنے کی کیا مجال ہے اس لئے میں نے صبر و شکر کیا اور چپکا ہو رہا +

دوسرے دن میرا نام بچہ بچہ کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ لوگ بازاروں میں قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے۔ کہ ہمنے خود آنکھوں سے دیکھا۔ آقا شیخ جعفر کے لئے ہزار اشرفیاں بھیجی گئی تھیں۔ لیکن اُس نے اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ یار لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ خود بادشاہ شیخ جعفر سے قول ہارا ہے کہ اگر تم سرکار کی مخالفت سے باز آجاؤ۔ تو ایک گاؤں کا

قبالہ تمہارے نام لکھ دیا جائے۔ لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا +

غرض آہستہ آہستہ میرا شمار شہر کے مشہور لوگوں میں ہونے لگا۔ حاجی علی بھی دو تین مرتبہ آیا۔ اور شکایت کی۔ کہ تم ہمیں بھول گئے۔ میں نے معذرت کی۔ کچھ ویر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وہ چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد سُنا۔ کہ اُس نے دکان کھول لی ہے۔ اور مزے میں ہے۔ آرام سے روٹیاں ملنے لگیں۔ تو لیڈری بھول گیا۔ چند مہینوں کے بعد انتخابات کا زمانہ آیا میں اعتدال پسندوں کے ٹکٹ پر کئی ہزار ووٹوں سے ممبر منتخب ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ تک ممبری کر کے دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ بڑا خطرناک کام ہے اگرچہ پانچوں گھی میں رہتی ہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے۔ کہ انسان لڑاکے مُرغ یا کھٹکنے کُتے کیطرح اُچھلتا کُودتا اور شور مچاتا رہے۔ کبھی لیک کے ایک وزیر کی ٹانگ لے کبھی دوسرے کی۔ میں نے اب تک عزت و آبرو سے عمر گذاری تھی۔ زندگی کا یہ ہنجار پسند نہ آیا۔ اس لئے اس چھوٹے سے شہر میں جو پایہ تخت کے شور و شغب سے دُور ہے۔ اُٹھ آیا ہوں۔ یہاں اپنی چھوٹی موٹی حکومت قائم کر رکھی ہے۔ اور آرام کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اب آپ سے یہی التجا ہے۔ کہ آئندہ مجھے لیڈر نہ سمجھیئے گا +

# ایک عورت

ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں نے اُفق کو ایک ردائے خونین اُڑھا رکھی تھی۔ مغرب کی طرف لال اور اودی بدلیوں کا ہجوم تھا۔ میں سمندر کے کنارے ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ سامنے کشتیاں اور جہاز اگن بوٹ اور موٹر بوٹ سمندر کی نیلگوں موجوں پر کنول کے پھولوں کیطرح ہلکورے لے رہے تھے۔ ہوا نرم اور سبک تھی۔ اور سمندر ساکن اور بے خروش۔ کبھی کبھی کسی سمندری پرندے کی چیخ اس سکوت کو توڑ دیتی تھی۔

کوئی شخص میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ میں نے نظر اُٹھا کے اُسے دیکھا ادھیڑ عمر کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ پچکے ہوئے گال۔ زرد چہرہ۔ آنکھیں اندر گھسی ہوئیں جنہیں چشمہ نے ڈھانک رکھا تھا۔ چگی داڑھی۔ طوطے جیسی ناک۔ کوٹ میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ پتلون بھی بہت پرانی معلوم ہوتی تھی +

بعض لوگوں سے ہم بارہا ملتے ہیں۔ لیکن اُن کے خدوخال ہمارے
ذہن میں محفوظ نہیں رہتے۔ اور بعض انسانوں کی صورت کچھ ایسی ہوتی
ہے۔ کہ ہم اُنہیں ایک جھلک دیکھ لیتے ہیں۔ اور مدتوں نہیں بھولتے
کبھی کبھی ہجوم میں کوئی چہرہ ہمیں لمحہ بھر کے لئے نظر آجاتا ہے اور ہمارے
ذہن پر ایک پائدار نقش چھوڑ جاتا ہے۔ مجھے اپنی طویل سیاحت کے
دوران میں اکثر ایسے عجیب و غریب چہرے نظر آئے ہیں۔ جو ساری عمر
یاد رہیں گے۔ مثلاً اسکندریہ کا وہ بڑا عطر فروش جسے میں نے سُوق الشیخ
کے نکڑ پر دیکھا تھا۔ کئی سال گذر جانے کے بعد بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے
وینس کا وہ کشتی بان جس کی کشتی پر میں نے اس شہر کی سیر کی تھی۔ اپنی متنفر
اور بے قرار نظروں کے باعث مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ میامو میں میں
نے ایک زیربادی عورت کو دیکھا تھا۔ جسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔
کہ کسی صناع نے چندن کی ایک ڈال سے بُت تراش دیا ہے۔ اور سچ
تو یہ ہے کہ میرے خیال کی دنیا اب بھی اُس کے تصور سے رنگین ہے
پھر مارسیلز میں خیر اِس قصے کو جانے دیجئے ۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ اس شخص کے چہرے میں کوئی ایسی بات تھی

کہ کوئی شخص اُسے ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ سمندر کی لہروں پر نظر جمائے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ لیکن اُس کے بڑبڑانے میں گریہ و فریاد کا انداز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کا دل دکھا ہوا ہے دنیا بھر میں کسی نے اُس سے کوئی نیکی نہیں کی۔ میں نے اُس کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر جی ہی جی میں کہا "یہ شخص کوئی ناکام ڈاکٹر معلوم ہوتا ہے۔ شاید بیچارے کی پریکٹس نہیں چلی۔" وہ سرک کر میرے قریب آگیا۔ اور بڑبڑانے لگا۔ اب اُس کی آواز زیادہ واضح ہوگئی تھی۔ لیکن اُس کے الفاظ قطعاً ناقابلِ فہم تھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ حلق سے نہیں بلکہ انتڑیوں سے نکل رہے ہیں۔ کیونکہ وہ قراقرِ معدہ سے بہت مشابہ تھے۔ یکایک وہ کسیقدر بلند آواز میں بولا "یہ سپید اور سُرخ کشتیاں یہ جہاز اور اسٹیمر کس طرح سمندر کے شفاف سینے پر دوڑ رہے ہیں۔ ہماری زندگی کی کشتی کا بھی یہی حال ہے۔ آج وہ پرسکون سمندر کی سطح پر مصروفِ خرام ہے۔ لیکن کل طوفانی موجیں اُسے اپنے آغوش میں لے لینگی۔"

یہ کہکر اُس نے میری طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ اب مجھ سے صبر نہ ہوسکا۔ میں نے پوچھا "کیا میں یہ جان سکتا ہوں۔ کہ آپ

کون ہیں"۔ اُس کے مُنہ سے ایک آہ نکل گئی۔ اور وہ گریہ آلود آواز میں بولا" ایک ناکام انسان"

" یہ تو میں پہلے ہی جان گیا۔ لیکن کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں۔ کہ آپ کی ناکامی کی وجہ کیا تھی؟"

"ایک عورت"

" ایک عورت!" میں نے تعجب سے اُسکی طرف دیکھا۔ تو پھر اس ناکام ڈاکٹر نے اپنی جوانی حسن و عشق میں بسر کی ہوگی۔ اللہ اس شخص کی داستان کتنی عجیب ہوگی۔

اُس نے اپنی جیب سے بیڑی نکالی۔ اور اُسے سلگا کے بولا" معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ میرا قصہ سننا چاہتے ہیں"

"جی ہاں"

" تو پھر سُنئے"

بیڑی کا دھواں ہوا میں منتشر ہو رہا تھا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے حلقوں سے ایک دلاویز رومان اُبھر رہا ہے۔

رات کے آٹھ بجے میں ہارنبی روڈ کے ایک سر بفلک مکان میں داخل ہوا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ اور میرا ناتواں جسم کانپ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دربان نے کہا "جلد چلئے۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے" پیچ در پیچ کمروں اور غلام گردشوں سے گذر کر ایک کمرہ میں پہنچا جس کے دروازوں پر مخمل کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ اور ایک حسین عورت جس کی پُر خمار آنکھیں عجیب اشتیاق سے دروازے پر لگی تھیں آتشدان کے قریب ایک صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ اور بولی "شکر ہے آپ آگئے۔ میں تو نوکر کو پھر آپ کے پاس بھیج رہی تھی۔ اے اللہ مجھے کیا ہو گیا۔ گھٹنوں میں درد ہے۔ سر چکرا رہا ہے۔ آنکھوں میں جلن ہے۔ خدا کے لئے مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں ؟

میں نے جواب دیا "دو تین دن آرام کیجئے"

وہ صوفے سے اُتر کر میرے قریب آگئی۔ اور مٹھیاں بند کر کے کرب آلود آواز میں بولی۔ آپ نہیں جانتے۔ میں آج رقص کرتی رہی ہوں فلم کا شوٹنگ ہو رہا ہے۔ کل مجھے پھر رقص کرنا ہو گا۔ بس میں اتنا چاہتی

ہوں۔ کہ گھٹنوں کے درد کا علاج ہو جائے۔ مجھ سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔

"آپ کو احتیاط کرنی چاہیئے۔ موسم خراب ہے"۔

اُس نے اپنی گوری گوری بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ اور کہنے لگی "خدا کے لئے بتایئے میں کیا کروں"۔

اُس کے عنبریں بال بکھرے ہوئے تھے۔ میرا افسردہ قلب اُس کے آرزو انگیز جسم کی حرارت اور اُس کے لمس کے لوچ کو محسوس کر رہا تھا۔ اِس حسینہ کو مصیبت میں دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا۔ اور میں نے نہایت حزیں آواز میں کہا "ٹنکچر آیوڈین لگایئے"۔

"ٹنکچر آیوڈین! کیا آپ کوئی اور دوا نہیں بتا سکتے؟"

"میری سمجھ میں اور کوئی علاج نہیں آتا۔ خدا آپ پر رحم کرے"

"ڈاکٹر، ڈاکٹر! تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں صبح کیا کروں گی؟"

میں نے حیران ہو کر کہا "ڈاکٹر؟ میں تو الکٹرک کمپنی کا مستری ہوں۔ آپ نے بلوایا تھا۔ حاضر ہو گیا"۔

اُس نے غصہ میں مجھے ڈھکیل دیا۔ اور بولی۔ گستاخ۔ بدتمیز۔ پاجی۔

اتنے میں ایک خدمت گار دوڑا دوڑا آیا۔ "حضور! ڈاکٹر صاحب

آگئے ہیں +

---

بیڑی بجھ گئی تھی ۔ اُس نے اُسے پھر سلگایا اور کش لگاتا ہوا آہستہ آہستہ بولا " پھر اُس نے الکٹرک کمپنی سے میری شکایت کی ۔ اور مجھے علیحدہ کر دیا گیا ۔ اب میں بیکار پھر رہا ہوں ۔ غرض میں ایک ناکام انسان ہوں ۔ اور میری ناکامی کا باعث ایک عورت ہے ۔

بیڑی کا دھواں ہوا میں پھیلا ہوا تھا ۔ اور اس کے ساتھ میرے متوقع رومان کے اجزا فضا میں تحلیل ہو رہے تھے ۔

---

# شاہجہان کی تصویر

میں نے یہ داستان ہمایوں جہاز پر ایک بوڑھے سوداگر کی زبانی سُنی تھی یہ شخص موتیوں کی تجارت کرتا تھا۔ اور مدت تک ہندوستان میں رہ چکا تھا۔ اس نے بیان کیا۔ کہ دہلی میں حاجی احمد ایک مشہور تاجر تھا جسکی تجارت دور دور پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے علاوہ عراق اور حجاز میں بھی اسکے کارندے مقرر تھے۔ جو ہر قسم کا سامان تجارت اُسے بھیجتے رہتے تھے حاجی احمد کی عمر کوئی پچاس سال کی تھی۔ لیکن ابھی تک اُسکی ڈاڑھی کا ایک بال بھی سپید نہیں ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں مضبوط تھے۔ اور وہ خود اپنے سارے کاروبار کی نگرانی کرتا تھا۔

حاجی بڑا نیک اور خدا ترس آدمی تھا۔ نماز روزے کا بڑا پابند نوکروں سے بھی اُس کا سلوک بہت اچھا تھا محلے ٹولے میں کوئی شخص بیمار پڑ جاتا۔ تو وہ رات رات بھر اُسکی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا لیکن اُس میں ایک بڑا عیب

یہ تھا۔ کہ اُسکی کفایت شعاری خست کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ اور وہ اپنی ذات پہ ایک پیسہ خرچ کرنے کو گناہ سمجھتا تھا +

اُس کے پاس صرف ایک عبا تھی جس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے عمامہ میں سوراخ ہی سوراخ تھے۔ لیکن حاجی احمدؒ اُسے اس ہوشیاری سے باندھتا تھا۔ کہ سوراخ نظر نہیں آتے تھے۔ البتہ سال میں وہ ایک مرتبہ نیا جوتا ضرور خریدا کرتا تھا۔ جب کوئی شخص اُس سے کہتا کہ حاجی صاحب آپ کو اللہ نے اتنا دے رکھا ہے۔ پھر بھی آپ کے لباس کا یہ حال ہے۔ تو حاجی غضبناک ہو کر کہتا۔ کیا تمہاری مرضی ہے۔ کہ میں بالکل ولیوالیہ ہو جاؤں +

ایک دفعہ حاجی احمد کو مال خریدنے کلکتہ جانا پڑا۔ چونکہ وہ بڑا محتاط آدمی تھا۔ اس لئے گاڑی چھوٹنے سے گھنٹہ بھر پہلے ہی اسٹیشن پر جا پہنچا۔ دیر تک ٹکٹ گھر کے سامنے کھڑا انتظار کرتا رہا۔ آخر ٹکٹ گھر کھلا اور وہ تیسرے درجہ کا ٹکٹ خرید کے گاڑی میں جا بیٹھا۔ اُس کے پاس بہت تھوڑا سامان تھا۔ ایک سفری بیگ ایک چھوٹا سا بستر۔ ایک لوٹا۔ ایک گلاس۔ لمبا سفر تھا۔ اس لئے اُس نے بستر کھول کر اپنی نشست پر بچھا لیا۔ اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگا +

تھوڑی دیر میں ڈبہ بھر گیا۔ مسافروں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ بوڑھے جوان، عورتیں، مرد گاڑی چلنے لگی۔ تو ایک بنگالی نوجوان کود کر چڑھ آیا۔ چونکہ ڈبے میں جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ اس لئے اُسے کھڑا رہنا پڑا لیکن تھوڑی دیر میں اُس کی ٹانگیں تھک گئیں اور وہ گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ شکل وصورت سے تعلیم یافتہ اور مہذب نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ ایک سوٹ کیس اور بستر کے سوا اُس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔

اُس نے ایک دو مرتبہ حاجی احمدؒ کی طرف دیکھا۔ لیکن پھر مُنہ پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ حاجی سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی حاجی اُس کے بشرہ سے اُسکی ذہنی کیفیت تاڑ گیا۔ اور کہنے لگا۔ میاں صاحبزادے آپ کہاں جانا ہے؟ اُس نے جواب دیا۔ میں کلکتہ جارہا ہوں حاجی بولا۔ تو پھر کب تک کھڑے رہیئے گا۔ آیئے میرے پاس بیٹھ جایئے نوجوان نے حاجی کا شکریہ ادا کیا۔ اور اُس کے پاس چپ چاپ بیٹھ گیا۔

حاجی اور یہ نوجوان آپس میں بہت جلد گھل مِل گئے اُس نے اپنا نام بنود کمار بتایا۔ اور کہا کہ میں کلکتہ کا ایک معمولی مصوّر ہوں۔ میری بہن دہلی میں ایک عہدہ دار سے بیاہی ہوئی ہے۔ اُس سے مِلنے آیا تھا۔ اب

واپس جارہا ہوں۔ وہ تھا تو بنگالی۔ لیکن ہندوستان کی عام زبان جسے ہندوستانی کہتے ہیں۔ بڑی آسانی سے بول لیتا تھا۔ اس لئے حاجی احمد کو اُس سے گفتگو کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی ٭

بنود بہت اچھا لڑکا تھا۔ اُس کی وجہ سے حاجی کو راستے میں بہت آرام ملا۔ ایک دفعہ حاجی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ تو اُس نے اپنے سوٹ کیس سے ایک دوا نکال کے کھلائی۔ جس سے حاجی بھلا چنگا ہوگیا۔ صبح کو وضو کے لئے پانی گرم کر دیا۔ حاجی کو بھوک لگی۔ تو جھپٹ کر اسٹیشن پر سے مسلمان روٹی والے کو ساتھ لوا لایا۔ اور حاجی نے کھانے کے دام دینے چاہے تو اُسے روک کر باصرار اپنے پاس سے پیسے ادا کر دیئے ٭

حاجی احمد اُس کے طور طریقے دیکھ کر جی ہی جی میں کہتا تھا۔ کہ آخر اس سودے میں بھی مجھے نفع ہی رہا۔ دراصل خوش خلقی سے صرف خدا ہی خوش نہیں ہوتا بلکہ خالص کاروباری زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ جب بھی اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے ٭

لیکن یہ نوجوان بعض اوقات حاجی کے چہرہ کی طرف اس طرح ٹکٹکی باندھ کے دیکھتا تھا۔ کہ حاجی گھبرا جاتا تھا۔ کئی مرتبہ اُس نے دل میں سوچا مجھے اس

طرح کیوں دیکھتا ہے۔کہیں کوئی پولیس کا آدمی نہ ہو۔کئی مرتبہ پوچھنا چاہا۔کہ تم مجھے یوں گھور گھور کے کیوں دیکھتے ہو۔لیکن ہمت نہ پڑی جب گاڑی پٹنہ کے اسٹیشن پر کھڑی ہوئی تو بنود نے خود یہ معمے حل کر دیا۔یعنی وہ حاجی کے چہرے کو دیکھ کر کہنے لگا۔ایک بات پوچھوں بُرا تو نہیں مانیئے گا۔حاجی نے جواب دیا۔میاں تمہیں جو کہنا ہے۔کہو بُرا کیوں مانوں گا۔وہ کہنے لگا۔کیا آپ دہلی کے مغل بادشاہوں کی اولاد میں سے ہیں؟ حاجی بولا نہیں میں تو عرب ہوں۔میرا باپ موصل کا رہنے والا تھا۔اور نوجوانی میں ہندوستان چلا آیا تھا۔یوں تو میں بھی موصل میں ہی پیدا ہوا۔لیکن پرورش ہندوستان میں پائی تمہیں یہ کیسے شُبہ ہوا؟ وہ کہنے لگا۔میں نے قدیم مرقعوں میں شاہجہان بادشاہ کی جو تصویر دیکھی ہے۔اُس سے آپ کی صورت شکل بہت ملتی جلتی ہے بلکہ میرا خیال ہے۔کہ اگر آپکو شاہی لباس پہنا دیا جائے۔تو آپ ہو بہو شاہجہان معلوم ہوں۔اس مشابہت نے مجھے حیرت زدہ کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے۔کہ میں آپ کے چہرے کو بار بار غور سے دیکھتا ہوں +

یہ سُن کر حاجی احمد کو یقین آ گیا۔کہ بنود سچ کہتا ہے۔اُس نے بچپن میں اپنی ماں کو کہتے سُنا تھا۔کہ میرے بیٹے میں بادشاہوں کی سی تمکنت ہے۔آخر اسکی

صورت شکل چال ڈھال میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جسکی بنا پر اُسکی ماں نے یہ رائے قائم کی تھی +

تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر بنود کہنے لگا۔ میں آپسے ذکر کر چکا ہوں۔ کہ میں بڑی مشکل سے اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ لیکن اگر آپ چاہیں۔ تو میری حالت بہت سدھر سکتی ہے۔ یہ سُنکر حاجی احمدؒ نے سمجھا۔ کہ شاید یہ نوجوان اپنی مفلسی کا ذکر کر کے مجھ سے قرض مانگنا چاہتا ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے جی میں کہا۔ میں اس مسٹنڈے کو ایک کوڑی بھی نہیں دونگا۔ پھر وہ بلند آواز سے کہنے لگا۔ افسوس کہ میں خود بہت غریب آدمی ہوں۔ اور آپکی مدد نہیں کر سکتا +

بنود کہنے لگا۔ میرا یہ منشا ہرگز نہیں۔ کہ آپ روپے پیسے سے میری مدد کریں بلکہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں۔ کہ آپ میرے ہاں چلکر شاہی لباس میں اپنی تصویر اُتروالیں۔ میں آپ کی شبیہ کو شاہجہان کی تصویر کے نام سے بیچوں گا۔ اور خدا نے چاہا تو تھوڑے دنوں میں ہزاروں روپے کمالوں گا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ لیکن میں اس کا معاوضہ ادا کرنے پر آمادہ ہوں +

حاجی احمد نے پہلے چاہا کہ تصویر اُتروانے سے انکار کر دے۔ کیونکہ

ایک تو وہ بڑا متقی آدمی تھا۔ اور تصویر کشی کو ناجائز سمجھتا تھا۔ دوسرے اُسے خیال تھا۔ کہ تصویر کھچوانے میں بہت وقت ضائع ہوگا۔ مگر جب نوجوان مصور نے معاوضہ کا ذکر کیا۔ تو اُسے یاد آگیا۔ کہ اس زمانے کے اکثر عالموں نے تصویر کشی کو جائز قرار دیا ہے اور بعض عالموں نے خود تصویریں کھچوائی ہیں۔ اگر اس طرح کچھ روپے ہاتھ آجائیں تو کیا ہرج ہے؟ یہ سوچ کر وہ کہنے لگا۔ تصویر کھینچنے میں کتنا وقت صرف ہوگا۔ مصور نے جواب دیا۔ صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ! اور اس کے عوض میں پچاس روپے آپ کی خدمت میں نذر کروں گا۔ حاجی احمد نے فوراً منظور کر لیا۔ پچاس روپے خاصی رقم تھی۔ اس میں آمد و رفت کا کرایہ اور کلکتہ کے قیام کا سارا خرچ نکل آئے گا۔ مصور نے بڑی دریا دلی دکھائی یعنی اُسی وقت پچاس روپے گن کے حاجی کے حوالے کر دیئے +

حاجی اور اُس کا رفیق سفر دونوں ایک موٹر بس میں سوار ہوئے اور جنوبی کلکتہ میں پہنچ کر اُترے۔ مصور نے ایک قلی کے سر پر سامان رکھا۔ اور یہ دونوں اُسے ساتھ لے کر پیچ در پیچ گلیوں میں ہوتے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے جا کر رُک گئے۔ بنود کمار نے جیب سے چابی نکال کر قفل کھولا۔ اور دونوں مکان میں داخل ہوئے اس مکان میں

صرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ایک کمرے کی دیواروں پر تصویریں کے خاکے لٹک رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں ایک پلنگ بچھا تھا کئی صندوق اور گھر کی ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ مصوّر نے ایک صندوق کھول کر ایک بڑے گھیر کا جامہ نیم آستین قبا۔ اور ایک تاج نکالا۔ تاج میں نقلی موتیوں اور نگینوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ جامہ اور قبا کی آستینوں اور سنجاف پر بھی موتی ٹکے تھے۔ مصوّر نے کہا۔ آپ یہ لباس پہن لیجئے۔ میں پاس کے کمرے میں آپ کا انتظار کرتا ہوں +

حاجی احمدؒ نے اپنے کپڑے اُتار کر کھونٹی سے لٹکا دیئے اور یہ لباس پہن لیا۔ سر پر تاج رکھ کر اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ سچ مچ ایک بہت بڑی ملکیت کا فرمانروا ہے۔ اور بدخشاں کے لعل۔ عمّان کے موتی اور جنوبی افریقہ کے ہیرے اُس کے قدموں پر ڈھیر کر دیئے گئے ہیں۔ اُس نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ تو اپنے رعب اور دبدبہ سے خود ہی کانپ اُٹھا +

جب وہ اس لباس میں مصوّر کے سامنے پہنچا۔ تو وہ حیرت اور تعجب

سے چلا اُٹھا۔ اور سر جھکا کر کہنے لگا۔ حضور میں کورنش بجالاتا ہوں۔ اُس وقت حاجی احمد کو اپنی بیوی یاد آرہی تھی۔ اور وہ جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ وہ کمبخت اِس وقت موجود ہوتی۔ تو میرے قدموں پر سر رکھ دیتی ٭

مصوّر نے حاجی کو سامنے بٹھا لیا۔ اور کہنے لگا۔ بالکل سیدھے بیٹھے رہئے۔ ہلئے جلئے نہیں۔ پھر وہ اُسکی تصویر اُتارنے میں مصروف ہو گیا اُس نے چند آڑے ترچھے خط کھینچے۔ اور پھر یکایک کہنے لگا۔ خدا جانے میں رنگوں کا ڈبّہ کہاں رکھ کر بھول گیا؟

آپ اسی طرح بیٹھے رہئے۔ میں آیا۔ یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ حاجی احمد تھوڑی دیر تو چپ چاپ بیٹھا رہا۔ لیکن جب نہ آیا۔ تو اُس نے چلّا کر کہا۔ میاں مصوّر جلدی کیجئے۔ مجھے ابھی بہت سے کام کرنا ہیں۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اب تو وہ گھبرایا۔ اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں پہنچا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اور کھونٹی پر اُس کی عبا بھی موجود نہیں تھی یہ دیکھ کر حاجی احمد کے ہوش اُڑ گئے کیونکہ اُس نے اپنی عبا کے استر میں دو بڑے بڑے ہیرے اور ساٹھ ہزار روپے کے نوٹ سی رکھے تھے۔ چونکہ وہ کلکتہ میں ایک پورا جہاز ولائیتی مال سے بھرا ہوا خریدنا چاہتا تھا۔ اِس

لئے وہ اتنا روپیہ اپنے ہمراہ لے کر آیا تھا +

حاجی احمد نے غور سے دیکھا۔ تو اُسے اس کمرے کی پشت پر ایک دروازہ ملا۔ مصوّر اسی دروازہ سے بھاگ نکلا تھا۔ اب تو وہ زور زور سے چلّانے لگا۔ کہ لوگو دوڑو۔ میں غریب مارا گیا۔ تھوڑی دیر میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اور حاجی کو سر پر تاج رکھے اور شاہانہ لباس پہنے دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ شور سُن کر مالک مکان بھی آ گیا۔ اُس سے معلوم ہوا۔ کوئی سات آٹھ دن ہوئے۔ دو نوجوانوں نے یہ مکان کرایہ پر لیا تھا اور مہینہ کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا تھا +

# لکڑی کی ٹانگ

"کیوں لالہ بنواری! تمہیں لکڑی کی ایک بڑھیا ٹانگ خریدنا ہے میں نے اسے دو سال ہوئے خریدا تھا۔ اور اب بیچنا چاہتا ہوں۔ ان دنوں بہت مفلس ہو رہا ہوں۔ یار۔ پھوٹی کوڑی تک پاس نہیں، اسے اپنے سے جدا کرنے کو جی تو نہیں چاہتا۔ لیکن پیٹ کے کارن چاہت کا یہ رشتہ توڑنا ہی پڑے گا۔ ٹانگ اچھی چیز ہے۔ اس کی مدد سے انسان بآسانی اندر باہر آجا سکتا ہے۔ مگر بھائی پیٹ کھانے کو مانگتا ہے۔ اب معاملہ کی بات کرو۔ یہ ٹانگ ولایتی ہے۔ اسپات کی کمانیاں۔ ربڑ کے جوڑ۔ لچکیلے پنجے اور ایڑیاں، بالکل ویسی ہے جیسی خریدتے وقت تھی۔ بلکہ اس سے اچھی سچ پوچھو۔ تو اس زنانے کی ٹانگ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ اگر زندگی کا کوئی لطف ہے۔ تو یہی۔ کہ یہ چوبی ٹانگ ہاتھ آجائے۔ بس یہ احساس ہی انسان کو خوش کرنے کے لئے کافی ہے۔ کہ یہ ٹانگ اسکی ملکیت ہے۔ میں تو

تم پر احسان کر رہا ہوں۔ لالہ۔ احسان جب تک جیتے ہو۔ دعائیں دو گے اور دام سنو گے۔ تو باچھیں کھل جائینگی۔ ادھر میں نے دام بتائے اُدھر تم نے کہا بمنظور۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ کہ میں تمہیں یہ ٹانگ چار سو روپے میں دے ڈالوں گا۔ اے توبہ۔ میں چھ سو کی جگہ چار سو کہہ گیا کیا؟ لیکن خیر اسے جانے دو جو منہ سے نکل گیا۔ نکل گیا۔ مردوں کی زبان ہے۔ بھائی مردوں کی زبان ہے۔ میں اور بات سے پھر جاؤں لیکن اتنے داموں تو مفت ہے"

لالہ بنواری لال بولے "لیکن مجھے مصنوعی ٹانگ نہیں چاہیئے۔

لنگڑے میاں نے پاجامہ اُٹھا کے ٹانگ دکھائی۔ اور کہا "اسمیں سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے بعض ٹانگیں تو تھوڑے دنوں میں ہی دغا دے جاتی ہیں۔ کسی کی کمانی ٹوٹ گئی۔ کسی کے جوڑ ہل گئے۔ یا پنجے مڑ گئے لیکن یہ ٹانگ جگری دوست کی طرح ساتھ دیتی ہے۔ نہ اسے نقرس ہو۔ نہ گنٹھیا۔ نہ خارش، نہ چنبل۔ نہ درد ہو۔ نہ دُکھے۔ اسے لگا کے تو انسان۔ انسان معلوم ہوتا ہے۔ ارے یار ذرا غور تو کرو۔ کسی راجے مہاراجے کو بھی ایسی ٹانگ نصیب ہے؟ جب چاہو لگاؤ جب چاہو کھول کے رکھدو۔ اور ایک ٹانگ کے ساتھ بستر میں جا گھسو۔ راجہ مہاراجہ

چھوڑ کسی شاہنشاہ کو اگر معلوم ہو جائے۔ کہ وہ اس لطف سے محروم ہے تو رو پڑے لیکن بادشاہوں کے ایسے نصیب کہاں؟ یہ ٹانگ تو تمہارے سوا کسی کے ہاتھ نہیں آسکتی۔ اصل میں میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ کہ یہ تمہیں ہی ملے۔ لو پچاس نقد چہرہ شاہی دلواؤ۔ اور یہ ٹانگ تمہاری ہوئی مجھے دکھ تو ہوگا۔ کہ ہمارے خاندان میں نہ رہی۔ لیکن کیا کیا جاوے؟ بس اب میں کچھ نہیں سنوں گا۔ اتنے داموں تو مفت ہے +

بنواری نے سن کے کہا "لیکن میرے کس کام کی ہے یہ؟"

"امان تم جانتے نہیں۔ تم خود استعمال نہیں کرو گے۔ تو بچے اسے گھوڑا بنا کے اس پر سواری گانٹھیں گے۔ آگ جلاتے وقت دستپناہ کا کام دے سکتی ہے۔ اصلی ٹانگ ذرا چولھے میں جھونک کے دیکھو تو سہی۔ کیا ہوتا ہے۔ چٹائیاں جھاڑنے۔ تمباکو کوٹنے کے کام بھی آسکتی ہے۔ گھروں میں بلیاں کتنے اکثر گھس آتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی کتے بلی پر پھینک کے دیکھو کیا مجال کہ پھر تمہارے گھر کی طرف رُخ بھی کرے۔ تم کتوں سے ضرور ڈرتے ہوگے۔ جہاں کتے کو آتے دیکھا۔ اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ اس میں جھینپنے کی کونسی بات ہے؟ جب تک میری خانہ ساز ٹانگ صحیح و سالم موجود تھی میرا

بھی یہی حال تھا۔ لیکن پارچے! یہ نقلی ٹانگ لگالو۔ کتوں کا کوئی ڈر نہیں رہے گا۔ دس لاکھ کتے بھی آجائیں۔ تو تمہارا کیا بگاڑ لینگے؟ کتوں کو آتے دیکھو تو اطمینان سے کھڑے مسکراتے رہو۔ اور یہ ٹانگ آگے بڑھا دو۔ اب وہ جتنا چاہیں۔ اسے نوچیں بھنبوڑیں۔ کاٹیں چبائیں۔ بھونک بھونک کے آسمان سر پر اٹھائیں۔ تمہارا کیا جائے گا؟ اسی لئے تو میں کہتا ہوں۔ کہ تم یہ ٹانگ لگا کے بہت بارعب آدمی معلوم ہوگے۔ اور جب مجھے یہ خیال آتا ہے تو جی چاہتا ہے۔ کہ تم سے خاص رعایت کی جائے یعنی ڈیڑھ روپے میں ہی دے ڈالوں کیسی جی کو لگی میری بات۔ لاؤ استاد ہاتھ، بس ڈیڑھ روپیہ نکالو۔ اور میں ابھی اتار کے تمہارے حوالے کئے دیتا ہوں۔ اتاروں؟"

لالہ بنواری نے پھر کہا "میرے کسی کام کی نہیں۔ صاحب۔ خدا نے مجھے دو ٹانگیں دے رکھی ہیں۔ ہاں اگر میں آپکی طرح لنگڑا ہو جاؤں ــــ تو ــــ"

"ارے یار! تم بھی کیا آدمی ہو؟ میری بات ابھی تک نہیں سمجھے۔ گوشت اور پوست کی اصلی ٹانگوں کا کیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں ماری ماری پھرتی ہیں کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا۔ ان سے تو لوگ اکتا گئے ہیں۔ جب دیکھو۔ وہی دو ٹانگیں۔ تم عام لوگوں جیسے تھوڑے ہی ہو۔ اگر مجھ میں تم اتنی خوبیاں ہوتیں

تو میں ایک ٹانگ کٹوا کے لکڑی کی ٹانگ لگوا لیتا۔ لیکن اگر تم ٹانگ کٹوانے پر روپیہ خرچنا نہیں چاہتے۔ تو پاجامہ میں تھوڑی سی قطع برید کر کے یہ خوشنما ٹانگ یونہی لگوا لو۔ کنکھجورا کیا ہے۔ زمین پر رینگنے والا ایک حقیر کیڑا۔ جانتے ہو کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اسکی سو سے کم کیا ہوں گی؟ اور اگر انسان کی جسے ساری خدائی اشرف المخلوقات کہتی ہے۔ تین ٹانگیں ہوں۔ تو کونسی آفت آ جائیگی۔ تم تین ٹانگوں سے چلنے لگو۔ تو نصیبا جاگ اٹھے تمہارا تین ٹانگوں والے بنئے کو دیکھنے کے لئے خلقت ٹوٹ نہ پڑے تو سہی۔ ساری قوم تم پر فخر کرے یورپ سے لوگ تمہیں دیکھنے آئیں۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمہارا نام مشہور ہو جائے۔ تمہارا کاروبار ایسا چلے کہ بس کیا کہوں؟ جو دیکھنے آئے آٹا چاول نون تیل تمہیں سے خریدے۔ ٹانگ کی ٹانگ اور اشتہار کا اشتہار شہرت، نیک نامی، عزت مفت میں۔ تم پرانی ٹانگوں کے ساتھ چلو گے۔ اور یہ نئی ٹانگ کھٹ کھٹ کرتی ساتھ ہو گی۔ یہ کھڑاک جو سنے گا۔ دوڑا دوڑا آئیگا اگر میری بات سمجھ میں آ گئی ہو۔ تو لاؤ ڈیڑھ پاؤ سنگھاڑے اور دودھ کا ایک پیالہ دلواؤ۔ اور یہ ٹانگ تمہاری ہوئی۔"

بنواری نے سنگھاڑے تولے۔ دودھ کا ایک گلاس اس کے حوالے

کیا۔ جب وہ سنگھاڑے جیب میں ڈال کے دودھ پی چکا۔ تو پجاری نے کہا "کہ اگر آپ یہ دونوں چیزیں نذر کے طور پر قبول کیجئے۔ اور تشریف لے جائیے۔ تو بڑی عنایت ہوگی"

اجنبی نے دروازے کے قریب پہنچ کر کہا "اچھا دوست رخصت لیکن یہ ناگ تمہاری ہو چکی۔ یوں سمجھو۔ کہ میں تمہارے ہاتھ رہن کر چکا۔ جب چاہو قبضہ کر لو میں اپنے وصیت نامہ میں اس بات کا ذکر ضرور کر جاؤں گا ۔ میری موت کے بعد بھی تمہیں شاید اسکی ضرورت نہ پڑے۔ اس لئے میں اسے بنک میں رکھوا دوں گا۔ اس کا سود تمہیں ملتا رہے گا۔ جب چاہو چیک بھیج کے بنک سے نکلوا لو۔ اچھا خدا حافظ"

# کلّو قانونی

کلّو اگرچہ موچی تھا۔ لیکن اُسے اپنے کام سے جتنا وقت فرصت کا ملتا تھا قانون پڑھنے میں صرف کر دیتا تھا۔ قانون کی چند پرانی کتابیں کہیں سے اُس کے ہاتھ آگئی تھیں۔ بس انہیں کی ورق گردانی کرتا رہتا تھا۔ اپنی اِس خصوصیت کی وجہ سے وہ گاؤں بھر میں کلّو قانونی کے نام سے مشہور تھا۔ اور آس پاس کے بعض دوسرے دیہات میں بھی اسکی قانون دانی کی دھوم تھی "

ایک دن غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے وہ بیٹھا جوتے بنا رہا تھا گاؤں میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا آس پاس کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ کہ اُسے چند آدمیوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی تھوڑی دیر میں چوہدری فتو اور لالہ بنواری لال اور دو آدمیوں سمیت نظر آئے۔ گاؤں بھر میں صرف فتو ہی میاں کلّو کے کمالات کا منکر تھا۔ اور اکثر اوقات اُسے

چھیڑتا رہتا تھا۔ یہ لوگ باتیں کرتے کرتے کلو کی دکان کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گئے۔ اور چوہدری فتو لالہ بنواری لال سے کہنے لگے تمہیں یقین نہیں آتا۔ تو کلو قانونی سے پوچھ لو۔ وہ جو کچھ کہے مجھے منظور ہے۔

کلو نے کام چھوڑ کر ملاس کی ڈبیا نکالی۔ اور ایک چٹکی لیکر ان لوگوں کی باتیں سننے لگا۔ چوہدری فتو اُسے متوجہ پاکر بولے۔ رمضان لوہار اپنے بیٹے رحمت کا بیاہ میری لڑکی زبیدہ سے کرنا چاہتا ہے۔ اور مجھے یہ بات منظور نہیں۔ جبتک رحمت اور زبیدہ جوان نہیں ہوئے تھے۔ دونوں کے ملنے جلنے میں کوئی ہرج نہیں تھا لیکن زبیدہ جوان ہے۔ رحمت کی عمر بھی اٹھارہ انیس کے قریب ہے۔ اس لیئے میں نے اُسے صاف صاف کہدیا تھا۔ کہ اب تمہارا ہمارے ہاں آنا جانا مناسب نہیں۔

آج جو میں اصطبل سے گھوڑا نکالنے گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک نوجوان اصطبل میں بیٹھا ہے۔ میں نے گھوڑا نکال کے دروازہ بند کیا۔ اور اُسے قفل لگادیا۔ لالہ بنواری سے اس معاملہ میں مشورہ کیا۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ تم جتنی دیر چاہو اُسے یونہی اپنے ہاں قید رکھ سکتے ہو۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ میری یہ حرکت خلافِ قانون ہے۔

اُسکے رشتہ داروں کو حق ہے۔ کہ اصطبل توڑ کے اُسے نکال لے جائیں مگر لالہ بنواری کہتے ہیں۔ کہ اگر وہ اصطبل کو توڑنا چاہیں۔ تو سرکار انہیں گرفتار کر لیگی +

لالہ بنواری کہنے لگے۔ میں کیا جھوٹ کہتا ہوں۔ قانون یہی ہے۔ یہ سُن کر کلّو کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا ہے۔ پھر اُس نے سر ہلایا اور کہنے لگا۔ اصطبل تمہارا ہے تم جب چاہو اُسے قفل لگا سکتے ہو +

لالہ بنواری لال بولے "چودھری! میں نہ کہتا تھا۔ کہ تمہاری یہ حرکت قانون کے عین مطابق ہے"

چودھری جی بولے "لیکن بھائی کلّو ——"

بھائی کلّو کس کی سُنتے تھے۔ ذرا تیز ہو کر بولے "جی ہاں۔ قانون یہی ہے۔ ہاں اگر تمہیں مجھ سے زیادہ قانون جاننے کا دعویٰ ہے۔ تو اور بات ہے۔ ایک نکتہ اور بتا دوں۔ میں تمہاری جگہ ہوتا۔ تو اصطبل کی چابی اب تک گم ہو گئی ہوتی۔

چودھری کہنے لگے "چابی گم ہو گئی ہوتی۔ وہ کیسے؟"

میاں کلو نے کہا "ہاں" اور کیا۔ اور جب تک یہ لونڈا اس بات کا وعدہ نہ کرتا کہ جیتے جی ادھر کا رُخ نہ کرے گا۔ چالی نہ ملتی"

چودھری جی بات پا گئے۔ اور کہنے لگے۔ بہت اچھا ہوا کہ میں سیدھا تمہارے پاس آگیا۔

کلو بولا "میں ہمیشہ اپنے گاؤں کے لوگوں کو نیک مشورہ دینے کے لئے تیار رہتا ہوں جب جی چاہے تشریف لے آئیے"

لالہ بنواری مسکرا کے بولے "تمہارا مشورہ واقعی بہت قیمتی ہے پھر وہ پلٹ کر رحمو تیلی سے کہنے لگے۔ تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

رحمو کی حالت سچ مچ بہت بُری تھی۔ مارے ہنسی کے اس کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ اُسے ہنستے دیکھکر جلال درزی بھی ہنسنے لگا۔ لالہ بنواری کچھ اور کہنے کو تھے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُن پر بھی ہنسی کا غلبہ ہو رہا ہے چنانچہ وہ کچھ کہے سُنے بغیر چل پڑے۔ چودھری جی نے بھی اُن کی تقلید کی اب سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور دن کی روشنی مدھم ہو چلی تھی۔ ان چاروں کے قہقہے ابھی تک سُنائی دے رہے تھے۔ کلو اُٹھا اور انگڑائی لیکر دوکان بڑھائی۔ اُس کا مکان دکان کی پشت پر تھا۔ رات کو جب کھانا کھانے

بیٹھا۔ تو بیوی کو رحمت کے پکڑے جانے کا واقعہ سنا کے کہنے لگا " اب امید ہے کہ چودھری اپنی بیٹی کا بیاہ جمن سے کر دے گا "

اُسکی بیوی بولی " اور تمہیں معلوم ہے۔ کہ زبیدہ بھی جمن کو دل سے چاہتی ہے۔

کلّو خوش خوش کھانا کھانے لگا۔ یکایک اُسے خیال آیا۔ کہ کہیں رحمت کے بجائے میرا بیٹا جمن ہی تو نہیں پکڑا گیا۔ اس خیال کے آتے ہی اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور جی ہی جی میں کہنے لگا۔ چودھری نے آج مجھے خوب بیوقوف بنایا۔ آج تک گاؤں کے لوگ مجھے بہت عقلمند سمجھتے تھے لیکن آج وہ کیا کہتے ہوں گے ؟

وہ حقہ پیتے پیتے دفعتہً چونک پڑا۔ پھر اُٹھ کر تالوں کی چند بوسیدہ کنجیاں نکالیں۔ اور انہیں بغل میں داب چودھری کے مکان کا رُخ کیا۔

چودھری کے مکان تک پہنچتے پہنچتے اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ اُس کا شبہ صحیح تھا۔ بہت سے لوگ سڑک پر کھڑے تھے۔ چودھری اور لالہ نیواری مکان کے سامنے چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ کلّو کو دیکھتے ہی کہنے لگے " آؤ کلّو! تم بھی اس لڑکے کو دیکھنے آئے ہو " اُس نے جواب دیا " نہیں میں

تو تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں۔ دراصل جب تم مجھ سے مشورہ کرنے آئے تو میں بہت مصروف تھا۔ جو کچھ ذہن میں آیا۔ کہہ دیا۔ اب جو کتاب دیکھی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ تمہارا خیال درست تھا۔ واقعی تمہیں اس لڑکے کو قید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسے حبسِ بیجا کہتے ہیں۔ اور حبسِ بیجا بہت بڑا جرم ہے +

چودھری بولے "میں نے تو تمہارے ہی مشورہ پر عمل کیا ہے لالہ بنواری۔ جلال اور رحمو گواہ ہیں +

کلو کہنے لگا "تمہارے جی میں جو آئے کرو۔ میں روکنے والا کون؟ پیر نے تمہیں قانون کی بات بتا دی۔ البتہ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا۔ تو اس لڑکے کو چھوڑ دیتا +"

چودھری نے کھانستے ہوئے کہا "اچھا بھائی یونہی سہی۔ میں اسے ابھی چھوڑے دیتا ہوں +

یہ کہہ کر وہ اصطبل کے دروازے کے قریب پہنچے۔ اور جیب کو ٹٹول کے کہنے لگے "لیکن خدا جانے چابی کہاں غائب ہو گئی۔ کیوں لالہ بنواری تمہیں معلوم ہے۔ کہ میں چابی کہاں رکھ کے بھول گیا +

کلّو بولا" تو قفل توڑ ڈالو"

چودھری جی کہنے لگے "قفل تو میں نہیں توڑتا۔ اب کوئی بھلا مانس میرے گھر میں گھس کر بیٹھ رہے۔ تو میں قفل توڑ کے اُسے نکالنے کا ذمہ دار تھوڑے ہی ہوں۔

کلّو کو غصہ بہت آیا۔ لیکن کیا کرتا۔ پتھر تلے ہاتھ دبا تھا۔ کتابیں اٹھائیں اور بڑے اطمینان سے گھر کی طرف چل پڑا +

بظاہر محسن بڑے مزے میں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ چودھری فتّو نے بہتیرے جتن کئے۔ کہ یہ کمبخت تو بہ تلا کرے۔ تو اسے چھوڑ دوں۔ مگر اُسکے وہی دم خم تھے ہنس ہنس کے باتیں کرتا۔ اور کہتا تھا۔ کہ چودھری جی مجھے آپ کے اصطبل میں گھر کا سا آرام ملا۔ کہیں نہ ہو۔ آخر سُسرال ہے +

چودھری کے جی میں کئی مرتبہ آیا۔ کہ اس کمبخت کو ٹھکانے لگا دوں۔ پھر سوچا کہ پہلے ہی بہت ذلت ہو چکی ہے۔ اس طرح اور جگ ہنسائی ہو گی +

دوسری صبح جب چودھری نے اُس سے جا کر پوچھا۔ کہ کہو کیا

حال ہے۔ تو وہ کہنے لگا۔ کہ میں نواب اِس اصطبل کو اپنا گھر اور آپ کو اپنا باپ سمجھنے لگا ہوں "

چودھری نے جمن کی باتیں سُن کر تہیہ کر لیا۔ کہ زبیدہ کو اُس کے ماموں کے ہاں بھیج دے۔ بیوی سے پوچھا۔ تو اُس نے بھی تائید کی۔

اُدھر میاں کلّو کی حالت خراب تھی۔ چودھری نے اُسکی ساری قانون دانی خاک میں ملا دی۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے جو پہلے دل سے اُسکی عزت کرتے۔ اور اُسے افلاطون کا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔ اب اُسکی دکان کے سامنے سے گزرتے وقت اُس پر آوازے کستے تھے۔ صبح ہی صبح گاؤں کی ایک عورت اُسکی دکان پر جوتی کی مرمت کرانے آئی۔ اور کہنے لگی۔ بڑے میاں۔ قانون میں وقت گنوانے سے اچھا ہے۔ کہ اپنا کام محنت سے کیا کرو۔ یہ نگوڑ ماری جوتی تم نے ہی بنائی تھی لیکن پورے چھ مہینے بھی نہ چلی۔ اور پانچویں مہینے ہی ٹانکے اکھڑ گئے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ کہ کلّو کو اپنے مکان کی کھڑکی کے سامنے زبیدہ نظر آئی۔ کلّو کے مکان کے ساتھ ہی ایک کوٹھا تھا۔ جس میں اُس کے اوزار گھر کی ضرورت کی چیزیں اور اناج پڑا رہتا تھا۔ کوٹھے کا دروازہ کھلا تھا

زبیدہ اُس کے اندر گھس گئی۔ کلو تھوڑی دیر تو اپنا کام کرتا رہا۔ پھر خیال آیا۔ کہ زبیدہ اس کوٹھے میں کیا کر رہی ہے۔ چنانچہ اُس نے دروازہ کھول کے اندر جھانکا۔ تو کیا دیکھتا ہے۔ کہ فرش پر ایک تختہ پڑا ہے۔ اور اس پہ زبیدہ سو رہی ہے۔ کلو ایک دو مرتبہ کھانسا جب وہ نہ جاگی۔ تو کلو نے چلنے کا قصد کیا۔ اتنے میں لڑکی نے کروٹ بدلی۔ اور بڑبڑانے لگی۔ "اللہ میاں کی گائے"۔ کلو سوچنے لگا۔ کہ خدا جانے کیسے اللہ میاں کی گائے کہہ رہی ہو کوئی خواب دیکھ رہی ہوگی۔ لڑکی نے پھر کہا "اندھا ہے کیا۔ کچھ نظر نہیں آتا"۔ کلو نے کہا "زبیدہ زبیدہ"۔ لڑکی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ پھر بڑبڑانے لگی "کاش اس میں اتنی عقل ہوتی۔ کہ دروازہ کے قفل لگا دیتا"۔

یہ سُن کر کلو سناٹے میں آگیا۔ پھر جو ہوش آیا۔ تو بھاگ کر دکان سے ایک قفل لے آیا۔ لڑکی پر ایک نظر ڈالی۔ اور دروازہ بند کر کے اُس میں قفل ڈال دیا۔

اُدھر زبیدہ کو اُس کے ننھیال بھیجنے کی طیاریاں ہو چکیں تھیں کہ زبیدہ غائب ہو گئی۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں سے پچھوایا۔ سب نے یہی کہا "یہاں تو نہیں آئی"۔ اب چودھری بہت گھبرایا۔ خود اسے تلاش کرنے

نکلا۔ اور سارا گاؤں چھان مارا لیکن زبیدہ کا سُراغ کہیں نہ ملا۔ وہ مایوس ہو کر واپس گھر کو جا رہا تھا۔ اور جی ہی جی میں کہہ رہا تھا۔ کہ زبیدہ جیسی جوان جہان لڑکی کا یوں دن دیہاڑے غائب ہو جانا اچنبھے کی بات ہے۔ کہ اُس کا گذر کلّو کے مکان کی طرف سے ہُوا۔ بوڑھا موچی اپنے کام میں منہمک تھا لیکن اُسے دیکھ کر یک بیک چودھری کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اور معاً اُس کا جی ڈوبنے لگا۔ اُس نے ایک دفعہ کھڑکی سے جھانک کے دیکھا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا لالہ بنواری کے پاس پہنچا۔ اور اُسے سارا حال کہہ سنایا اُسکی باتیں سن کر لالہ بولا "چودھری جی آپ کا خیال درست ہے۔ کلّو کو احمق نہ سمجھیئے۔ بڑا کایاں ہے۔ لیکن بڑے رکھ رکھاؤ سے بات کیجئے گا۔ آپ نے ذرا بھی گھبراہٹ ظاہر کی۔ اور معاملہ بگڑ گیا۔

یہ کہہ کر اُس نے چودھری کو ساتھ لیا۔ اور دونوں باتیں کرتے کلّو کی دوکان کی طرف چل پڑے۔ وہ اُسی طرح کام میں لگا ہوا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر اُس نے ہاتھ روک لیا۔ لالہ بنواری بولے "کلّو مجھے تھوڑی دیر کے لئے کدال چاہیئے۔ کلّو نے کہا۔ لالہ سارا گھر تمہارا ہے۔ کدال کی کیا حقیقت ہے۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کوٹھے کی طرف چلا لیکن اُس

کے دروازے میں قفل دیکھ کر جیب ٹٹولتا ہوا واپس آیا۔ اور کہنے لگا۔ لالہ تمہیں کدال ضرور چاہیئے۔ لالہ نے کہا۔ ہاں بھئی۔ ورنہ تم سے کیوں مانگنے آتا۔ کلّو نے کہا۔ کوٹھے کا دروازہ بند ہے۔ اور چابی خدا جانے کہاں ہے۔" یہ سُن کر چودھری کو تاب نہ رہی۔ اور اُس نے چلّا کے کہا۔ ابے او موچی کے بچے دروازہ کھولتا ہے کہ نہیں تو نے میری بیٹی اس کوٹھے میں چھپا رکھی ہے +

کلّو نے کہا "چودھری تم گھاس کھا گئے ہو کیا۔ تمہاری لڑکی یہاں کیسے آئی۔ چودھری نے کہا میں کچھ نہیں جانتا۔ دروازہ کھول نہیں تو میں اسے توڑتا ہوں۔

کلّو بولا" میں سچ کہتا ہوں۔ کہ چابی میرے پاس نہیں جُمّن کل سے کہیں غائب ہے۔ ورنہ وہ پل بھر میں چابی تلاش کر لیتا +

چودھری غصّہ میں دانت پیسنے لگا لیکن کلّو کی بات کا کوئی جواب نہیں سُوجھتا تھا۔ بنواری اُسے لال پیلا ہوتے دیکھ کر کہنے لگا۔ دیکھا چودھری میں نہ کہتا تھا۔ کلّو قانونی کے پیش پانا آسان نہیں" کلّو کہنے لگا" جُمّن اب آتا ہی ہوگا"

چودھری سُنکر تیز تیز قدم اُٹھاتا اپنے گھر کی طرف چل پڑا اور تھوڑی دیر میں چمن کو ساتھ لے آیا۔ کلّو بیٹے کا بازو پکڑ کر اندر لے آیا۔ تھوڑی دیر میں دونوں باپ بیٹا نکلے۔ چمن کے ہاتھ میں چابی تھی۔ اُس نے کوٹھے کا دروازہ کھولا۔ تو زبیدہ انگڑائی لیتی اُٹھی۔ مگر باپ کو دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ چودھری بولا "تم یہاں کیونکر آ گئیں؟"

زبیدہ رونی صورت بنا کر کہنے لگی "میں۔ میں۔ جانا نہیں چاہتی تھی"

چودھری نے رُک کر کہا "اچھا ناشدنی تو یہیں رہ۔ تو نے خاندان کی ناک کٹوا دی"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ لالہ بنواری لال اور میاں کلّو بھی پیچھے پیچھے تھے۔ بنواری نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا "چودھری! اب لوگ کلّو کے بجائے تم پر ہنسیں گے"

چودھری فتو نے ہاتھ جھٹک دیا۔

کلّو قانونی بولا "سنو تو! تمہیں اپنی لڑکی پر فخر کرنا چاہیئے عقلمندی میں ہم تینوں اُسے نہیں پہنچتے۔ اگر چمن سے اُس کا بیاہ کر دیا جائے۔۔۔

—تم کہاں جا رہے ہو؟ لسی تو پی لو۔"

ہنواری اور کلو دونوں نے چودھری فتو کو پکڑ لیا۔ اور مکان کے اندر لے گئے۔ چودھری پہلے تو غصہ میں تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اُس کا غصہ دھیما ہو گیا۔ اور چارپائی پر بیٹھ گیا +

---

# نئی اِصلاحات

(ایک بھنگڑ کی زبانی)

اگر کوئی پوچھے کہ تمہیں چنے کے کھیت۔ آلو کے بھُرتے۔ کدو کی بیل قلاقند۔ گنے۔ موٹر کی سواری اور نئی اصلاحات میں کونسی چیز سب سے زیادہ پسند ہے۔ تو میں کہوں گا۔ کہ نئی اصلاحات مجھے سب سے زیادہ مرغوب ہیں خدانخواستہ یہ کہنے سے آلو کے بھُرتے۔ گنے یا قلاقند کی توہین مقصود نہیں۔ یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں۔ بات تو یہ ہے کہ اصلاحات سے تنہا مجھے ہی نہیں۔ بلکہ میری طرح دوسرے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ اور ان چیزوں کی افادیت کا دائرہ کسی قدر محدود ہے مثلاً چنے کے کھیت ہی کو لیجئے جن لوگوں کو چنے کے کھیت سے پوری طرح فائدہ اُٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ اُنہیں موٹر کی سواری میسّر نہیں اور جنہیں موٹر کی سواری میسّر ہے۔ وہ چنے کے کھیت کے فوائد سے

بے نصیب ہیں۔ خیر میں یہ تفصیل بیان کر کے آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ میرے عقیدے میں کونڈی ڈنڈے کے بعد اصلاحات کا ہی درجہ ہے۔ اس سے کسی کو انکار ہو تو ہوا کرے۔ میں کوئی خدائی فوجدار تھوڑے ہی ہوں۔ انکار سے کسی چیز کی وقعت کم نہیں ہوتی۔ یوں تو التد کے منکر بھی ہزاروں نہیں لاکھوں ہیں۔ اور انہیں نہ ملیریا ہوتا ہے نہ انفلوانزا نہ بخار۔ نہ نمونیا۔ بخار کے تذکرہ میں ایک بات یاد آگئی لیکن میں اصلاحات کے متعلق باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے اس قصہ کو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتا ہوں +

اصلاحات اصلاح کی جمع ہے۔ اور اصلاح خط بنوانے یا سر منڈانے کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اصلاحات کے معنی بہت سی حجامتوں کے ہوئے۔ لیکن جدید اصلاح میں اصلاحات کے معنی یہ نہیں۔ بلکہ حکومت کے رنگ ڈھنگ۔ ادب آداب میں جو ادل بدل ہوا ہے۔ اسی اصلاحات کہتے ہیں۔ حجامت سے اصلاحات کو اگر کوئی نسبت ہے۔ تو صرف اسی قدر۔ کہ حجامت کا نزول سر پر ہوتا ہے۔ اور اصلاحات کو بھی سر سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یعنی جس گروہ نے اصلاحات کا خاکہ مرتب

کیا۔ اس میں ہندوستان اور انگلستان کے بہت سے "سر" شامل تھے یہی وجہ ہے۔ کہ میں اصلاحات کا نام سنتا ہوں۔ تو معاً مجھے ملا بقل بطورا کا گھٹا ہوا سر یاد آجاتا ہے۔ جس کی "فارغ البالی" کی تلافی اُن کی گنجان اور ضرورت سے زیادہ طویل داڑھی نے کر دی ہے۔ یا پھر اپنے آپ کو تصور ہی تصور میں ایک سہارنپوری حجام کے سامنے پاتا ہوں۔ جو استرہ ہاتھ میں لئے اس ارادہ سے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ کہ میرے سر کو ملا جی کے سر کا مصرع ثانی بنا دے۔ اور میں اس سے کہہ رہا ہوں۔ کہ

اشتر صراحی گردنا
دانم چہ خواہی کردنا
گردن درازی می کنی
پنبہ بخواہی خوردنا

شیخ چلی مرحوم کے متعلق مشہور ہے۔ کہ وہ ایک مرتبہ کسی نوآموز حجام کے قابو میں آگئے تھے۔ حجام نے سر کو جگہ جگہ استرے سے فگار کر دیا۔ اور جہاں زخم لگایا۔ فوراً کسوت سے تھوڑی سی روئی نکال کر وہاں چپکا دی جب آدھا سر منڈا چکا۔ تو شیخ صاحب نے فرمایا۔ اب بس بھی کرو حجام

نے عرض کیا۔ کیوں حضور۔ کیا ہوا۔ شیخ صاحب نے کہا۔ تم نے آدھے سر میں روئی بوئی۔ اب آدھے سر میں گیہوں کاشت کروں گا۔ خیر شیخ چلی مرحوم تو بڑے سرتے اور سیانے تھے۔ آدھا سر بچالے گئے۔ اگر میں سر منڈانے کی جرأت کر بیٹھوں تو پورے سر میں روئی کاشت ہوگی۔ اور روئی ہی اُگے گی۔ کیونکہ۔

گندم از گندم بروید جو ز جو

تاہم اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ سہارنپوری حجام شعر و شاعری کا اچھا خاصا مذاق رکھتے ہیں۔ اور سخن سازی پر اُتر آئیں۔ تو بال کی کھال اتارتے ہیں۔ سر بھی مونڈتے جاتے ہیں۔ اور کوئی داد دے نہ دے۔ ساتھ ساتھ اپنی چابکدستی اور ہنرمندی کی تعریفیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ اور گاہک پر ہمیشہ یہی ظاہر کرنے کی سعی فرماتے ہیں۔ کہ سر منڈانے میں سراسر اسی بچارے کا فائدہ ہے۔ ورنہ انہیں تو صرف ثواب اخروی کی تمنا ہے۔ کسی دنیوی فائدہ سے سروکار ہی نہیں۔

بہرحال "حجامت" اور "ثواب اخروی"۔ یا حجامت اور سخن سازی ایک علیحدہ موضوع ہے۔ جس کے متعلق بہت کچھ کہا جاسکتا ہے اصل

مسئلہ تو اصلاحات کا ہے۔ جو اگرچہ مسئلہ حجامت کی طرح دقیق تو نہیں تاہم ؎

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست

اصلاحات کے اور فوائد تو جانے دیجئے۔ اس قدر تو واضح اور بدیہی ہے۔ کہ کوٹھیوں اور جھونپڑوں، موٹروں اور بہلیوں میں جو فاصلہ تھا اسے نئی اصلاحات نے بہت حد تک کم کر دیا ہے۔ خصوصاً الیکشن کے موقع پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوٹھیوں اور جھونپڑوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ زین اور سرج۔ گاڑھا اور تن زیب۔ ہیٹ اور پگڑی، پتلون اور تہ بند آپس میں گلے مل رہے ہیں۔ مشرق اور مغرب۔ ادنیٰ و اعلیٰ پست و بلند کا امتیاز مٹ گیا ہے۔ ننھو چمار۔ فتو لوہار، میاں سائیں کوڈے شاہ۔ اور میاں گھسیٹا کو پہلے کون پوچھتا تھا۔ دنیا کی نظروں میں بھنگڑ دل کی کیا قدر تھی۔ کونڈی ڈنڈے کو چینی کے گلدانوں کے ساتھ کون جگہ دیتا تھا؟ لیکن پچھلے الیکشن میں یہ سب کچھ ہوا یعنی خاں صاحب چوہدری صاحب اور مولانا بلغ العلیٰ کے چھوٹے بھائی تینوں باری باری سائیں کوڈے شاہ کے تکیہ میں آئے۔ ایک ایک سے ملے۔ بچوں کی خیر و عافیت

پوچھی۔ اپنی دوستی اور خلوص کا یقین دلایا۔ کوڈے شاہ کے کتے کو چمکارا کبوتروں کو دیکھا بھالا۔ تیتروں کے نعرے سُنکر جھومے۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے کونڈی ڈنڈے کی ساخت اور ہیئت پر غور کیا۔ بھنگ افیون اور چرس کی تعریف فرمائی شراب کی مذمت کی۔ چودھری صاحب تو اُن سب سے بازی لے گئے یعنی گڑے مردے اکھیڑے۔ ایک ایک سے کوئی نہ کوئی پُرانا رشتہ نکال لائے کسی سے کہا۔ کہ ہمارے دادا اور آپ کے والد میں گاڑھی چھنتی تھی ابا جان مرحوم اکثر ذکر فرمایا کرتے تھے۔ میری بدقسمتی کہ اب تک دیدار سے محروم رہا کسی سے فرمایا۔ کہ ہم اور آپ یک جدی ہیں۔ یعنی ساتویں پشت پر ہمارا اور آپ کا شجرہ نسب مل جاتا ہے۔ ایک دن میں ان کے ہاں گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کہنے لگے۔ آپ کی کیا تواضع کروں۔ چائے کا تو آپ کو کچھ ایسا شوق نہیں۔ پھر یہ چائے کا وقت بھی نہیں۔ کہیئے تو سبزی کا انتظام کر دیا جائے۔ میں نے کہا اس کی کیا ضرورت ہے۔ اُنہوں نے نہ مانا۔ ایک آدمی کو دوڑایا۔ کہ کونڈی ڈنڈا لے آؤ۔ دوسرے کو بھنگ اور بھنگ کے لوازم لینے بھیجا۔ غرض ایرانی قالین صوفوں چینی کے گلدانوں پیتل۔ سیپ اور ہاتھی دانت کے بتوں اور ایکٹریسوں کی تصویروں میں بھنگ گھٹی۔ چھنی

اور پی گئی۔ اور ہم مونچھوں پر تاؤ دیتے گھر آئے۔ لیکن اس تذکرہ میں۔ مولانا بلغ العلی کا نقشہ رہا جاتا ہے۔ وہ بھنگ کے معاملہ میں سب سے زیادہ سخت گیر تھے۔ یعنی کبھی کوڑے شاہ کے تکیئے کے پاس سے گزرتے تھے۔ تو ہمیں ورن دھاڑے خلاف شرع حرکات کرتے دیکھ ان کی گردن کی رگیں پھول جاتیں۔ آنکھیں سُرخ ہو جاتیں اور مُنہ سے کف بہنے لگتا۔ اور سچ پوچھئے تو ہم سب کو ان کی جریب زیتونی سے ڈر لگتا تھا۔ کہ کہیں مار بیٹھیں۔ تو دادنہ فریاد۔ لیکن الیکشن میں ان کے زہد و پارسائی کی قلعی بھی کھل گئی۔ یعنی خود تکیہ پر تشریف لائے۔ اور ووٹ کے لئے التجا کی۔ احباب نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ کہ یہ بھنگڑوں کا لیڈر ہے۔ جو کچھ کہنا ہو۔ اس سے کہیئے۔ اب وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ پہلے عربی زبان میں کچھ فرماتے رہے۔ پھر کبریا اور نام حق کے چند شعر پڑھے اور اما بعد کہہ کر صرف مطلب زبان پر لائے۔ میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ کا ارشاد بجا درست۔ لیکن یہ تو فرمائیے۔ کہ آپ اسمبلی میں جا کر ہم بھنگڑوں کی نمایندگی کیسے فرمائیں گے؟ کہنے لگے میں مطلب نہیں سمجھا۔ میں نے عرض کیا۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ اس حلقہ سے کوئی بھنگڑ

ہی کھڑا ہو۔ جو بھنگڑوں کے خاص مسائل کو اچھی طرح سمجھ سکے۔ اور ہمارے حقوقِ خاص کی حمایت کر سکے۔ کہنے لگے۔ یہ معاملہ بھی اس فقیر پر چھوڑ دیجئے انشاء اللہ آپ کی اور آپ کے ہم مشرب احباب کی نمایندگی کا حق بوجہ احسن ادا کروں گا۔ میں نے کہا۔ اچھا ہمیں ذرا اس مسئلہ پر غور کرنے کی مُہلت دیجئے۔ اس دن سے ان کا یہ حال تھا۔ کہ بھنگ کو از راہ تعظیم ہمیشہ ورق الخیال کہتے تھے۔ اور قاف کو ادا کرتے وقت گردن کو اس طرح لٹکا دیتے تھے۔ کہ وہ ان کے حلق سے دُگنا ہو کے نکلتا تھا۔ مجھے تو یقین ہے کہ اگر ہم ان کو بھنگ پینے کو کہتے۔ تو انہیں اس میں بھی دریغ نہ ہوتا۔

کچھ دنوں میں الیکشن کا زمانہ سر پر آپہنچا۔ ان دنوں سائیں کوڈے شاہ کے آس پاس بڑی گھما گھمی اور رونق رہتی تھی۔ موٹریں آرہی ہیں جا رہی ہیں۔ منتیں ہو رہی ہیں۔ التجائیں کی جا رہی ہیں۔ بھنگ اور بھنگڑوں کی شان میں قصیدے کہے جا رہے ہیں۔ دیگیں چڑھی ہیں۔ پلاؤ بھی ہے قورمہ بھی۔ میٹھے ٹکڑے بھی۔ مُرغ مُسلم بھی۔ باداموں کی بوریاں بھری ہوئی چلی آتی ہیں کبھی مولوی صاحب کا آدمی آیا کبھی خانصاحب تشریف لائے۔ کبھی چوہدری صاحب کے ماموں جھلک دکھا گئے۔ جو آیا کچھ دے ہی گیا۔ یہاں جواب

میں ووٹ دینے کے سوکھے وعدوں کے سوا اور کیا تھا۔ وعدے تو ہم نے سب ہی کر رکھے تھے لیکن ووٹ آخر میں چودھری صاحب کو دیئے کیونکہ انہوں نے وعدے بھی سب سے زیادہ کئے تھے۔ اور روپیہ بھی سب سے زیادہ خرچ کیا تھا۔ پھر ان کے ہاں کے پلاؤ میں گھی خالص تھا۔ اور بادام ہمیشہ کاغذی بھیجتے تھے۔

الیکشن کے دنوں میں ایک ناگوار واقعہ پیش آیا۔ یعنی بیگم سے چیخ چل گئی۔ وہ کئی دن سے الیکشن اور ووٹ کا ذکر سن رہی تھیں عورتیں ناقص العقل ہوتی ہی ہیں۔ میری بدقسمتی سے وہ الیکشن کو گلشن کے قبیل کا لفظ سمجھیں۔ اور ووٹ کو نوٹ یعنی یہ فرض کر لیا۔ کہ بی الکشن مس گلشن کی بہن ہیں۔ اور میرے اس کے درمیان نوٹوں کے داد و ستد کا معاملہ ہے۔ میں نے ہر چند کہا کہ پہلے میری بات سن لو۔ پھر کچھ کہنا۔ جواب ملا۔ نوج۔ میں ان اوپر والیوں کو خوب جانتی ہوں۔ غرض ادھر سے کہا گیا۔ کہ

مینزہ منم دخت افراسیاب

اور ادھر سے جواب ملا:۔

## من گرز و میدان و افراسیاب

اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اسکی کیفیت فردوسی نے صرف ایک شعر میں بیان کر دی ہے۔

دریدو بریدو شکست و ببست
یلاں را سر و سینہ و پا و دست

الیکشن گزر گیا۔ لوگ اسمبلی میں جا پہنچے۔ اگرچہ زندگی کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ یعنی بھنگ۔ چرس۔ افیون رات کے نو بجے کے بعد نہیں ملتی۔ ہیں اور میاں گھسیٹا اسی طرح سڑک کے درمیان چلتے ہیں اور تانگے والے اسی طرح بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے ہٹو بچو کہے بغیر سڑک کے بیچوں بیچ گزرتے ہیں۔ اور کبھی میں میاں گھسیٹا کا بازو پکڑ کر کھینچ لیتا ہوں۔ اور کبھی میاں گھسیٹا مجھے گھسیٹ کر درجہ شہادت حاصل کرنے سے محروم کر دیتے ہیں۔ دفعہ ۱۴۴ اب بھی کبھی کبھی نافذ ہو جاتی ہے۔ پھر بھی الیکشن کے دنوں کی خوشگوار یاد زندگی کو تلخ نہیں ہونے دیتی۔ ایک دن چوہدری صاحب مل گئے میں نے کہا اتنا ابھی تک سنتا ہے بھنگ مہنگی ہے گھٹنے کے بھاؤ میں کوئی فرق نہیں

آیا۔ اور میں سنتا ہوں۔ کہ آپ کو قلاقند سے زیادہ کیک مرغوب ہے۔ اس ریوڑی کے پھیر میں نہ پڑیئے۔ کیونکہ زمانہ نازک ہے۔

تم نے دیکھے ہی نہیں نازونزاکت والے

میری بات کا یقین نہو تو قانون مسعودی مطبوعہ نولکشور کا صفحہ ۳۵۵ ملاحظہ فرمائیں۔ تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا۔ آپ خود عقلمند ہیں۔ اور اگلے بزرگ کہ گئے ہیں۔ کہ یک من علم را دہ من عقل باید۔ پہلے عقل تل کے بکتی تھی۔ اور صرف تھوک بکتی تھی۔ اب اسکی خرید فروخت کے تمام حقوق بحق سرکار متقل ہو چکے ہیں۔ خیر آپ سے اور کچھ نہیں ہو سکا۔ تو گھی کی تجارت پر تو کوئی پابندی نہیں۔ بالفعل گاؤں سے گھی کا ایک کنستر منگوا دیجئے۔ انہوں نے مسکرا کے فرمایا ضرور اور چل دیئے +

بہر حال خدا کا شکر ہے کہ اصلاحات آگئیں۔ یہ اور بات ہے کہ گھی کا کنستر اب تک نہیں آیا +

# قصہ سوتے جاگتے کا

یہ داستان میں نے اپنے ساتویں سفر میں بغداد کے ایک کبڑے مصور سے سُنی تھی۔ اور اُسنے یہ کہانی نقل کی۔ ایک ارمنی طبیب نے جو ایک آنکھ سے کانا اور ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا۔ اور اس ارمنی طبیب نے خود مرزا حسن تبریزی سے یہ واقعہ سُنا تھا۔

کہا مرزا حسن نے کہ جب میں بغداد آیا۔ تو میرے پاس ایک قبہ بھی نہیں تھا۔ ایک شیرازی سوداگر نے جو جواہرات کی تجارت کرتا تھا میری نوجوانی اور بے وطنی پر ترس کھا کے مجھے اپنے ہاں نوکر رکھ لیا۔ میں نے اس مستعدی اور دیانتداری سے کام کیا۔ کہ میرے آقا کی تجارت جو نوکروں کی بددیانتی اور غفلت کے باعث رو بہ زوال تھی۔ پھر چمک اُٹھی اور اکثر فرنگی تاجر ہمارے ہاں سے مال منگوانے لگے۔

بوڑھا سوداگر میری کارکردگی اور دیانتداری سے ایسا خوش ہوا۔ کہ

کچھ عرصہ کے بعد اُس نے اپنی اکلوتی بیٹی مجھ سے بیاہ دی۔ اور کاروبار میں میرا حصہ مقرر کر دیا۔ چونکہ اُس کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں تھا میری ساس کو بھی انتقال کئے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ اِس لئے اب میری بیوی اُسکی ساری جائداد کی وارث تھی لیکن ہماری شادی کو سال بھر بھی نہ گزرنے پایا تھا۔ کہ اُس عقیقہ نے وفات پائی۔ میرا خسر بیٹی کی جدائی کے صدمے سے جانبر نہ ہو سکا۔ اور تھوڑے دنوں میں اُس نے بھی دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رجوع کیا +

اگرچہ میرے خسر کا کاروبار بہت وسیع تھا۔ اور اب میں بلا شرکت غیرے اُس کا مالک تھا۔ لیکن بیوی کی موت نے دل پر ایسا اثر کیا۔ کہ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا چند روز یہی کیفیت رہی۔ آخر ایک دوست نے جو مجھ سے عمر میں بڑا اور زمانے کا نشیب و فراز دیکھے ہوئے تھا سمجھایا۔ کہ اے عزیز زمانے کا یہی ہنجار ہے۔ موت پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ قضائے الٰہی سے جو ہونا تھا۔ سو ہوا۔ اب صبر کرو۔ اور کسی طرح جی نہیں سنبھلتا تو شراب کو انیس و مساز بناؤ۔ کہ رُوح کو راحت اور قلب کو قوت بخشتی۔ اور آئینہ خاطر سے گرد ملال دور کرتی ہے۔ یہ کہہ اُس نے اُس یعقوب زمنی کے لئے

حملہ شیراز اور پرتگال کے افشردہ انگور کی چند بوتلیں منگوائیں۔ اور اپنے ہاتھ سے جام بھر کر پیش کیا۔ واقعی ایک دو جام پینے سے ایسا سرور نصیب ہوا۔ کہ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی ساری تکلیفیں بھول گیا۔ اور عالم سرخوشی میں گنگنانے اور حافظ کے شعر جو اُس نے شراب کی تعریف میں لکھے ہیں۔ پڑھنے لگا۔ اُس شخص نے جو بظاہر میرا یار جانی اور بباطن میری تباہی کے درپے تھا۔ "جب تک چنگ و رباب اور عود و قانون موجود نہ ہو۔ شعر خوانی کا لطف نہیں آتا"۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں ایک مغنیہ کو جو عرب و عجم کی موسیقی پر عبور رکھتی ہے۔ اور جمال ظاہری سے بھی آراستہ ہے۔ بلوالوں۔ مجھے اس وقت نیک و بد کی کوئی تمیز نہیں رہی تھی۔ کہا کیا مضائقہ ہے۔ وہ تو یہی چاہتا تھا۔ بھاگا بھاگا گیا۔ اور اپنے ساتھ ایک حسینہ کو جو نسل یہود سے معلوم ہوتی تھی۔ ساز و سرود سمیت لے آیا۔

رات بھر رقص و سرود کی محفل آراستہ رہی۔ صبح کو میں نے انہیں رخصت کیا۔ اور خود پڑ کے سو رہا۔ شام کو آنکھ کھلی اُس وقت سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ اور طبیعت میں ایک عجب بے چینی تھی۔ میں نے غسل کیا۔ اور چاہا۔ کہ دکان کا حساب دیکھوں۔ اتنے میں وہی شخص آیا۔ اور میری کیفیت

سن کر کہنے لگا۔ بجز شراب اس مرض کا کوئی علاج نہیں۔ بوعلی سینا نے قانون میں یہی لکھا ہے غرض اسکی ترغیب سے پھر شراب پر لگا لی کا دور چلا۔ اور وہ رات بھی اسی مشغلہ میں کٹ گئی۔ پھر تو مجھے ایسی چاٹ پڑی کہ رات دن محفل ناؤ نوش گرم رہنے لگی۔ اکثر ظریف اور بذلہ سنج لوگ جنہیں دربار داری کے آداب اور رئیسوں کو خوش کرنے کے ڈھنگ خوب یاد تھے۔ برسم مصاحبت شریک محفل ہوئے۔ اور خلوت و جلوت کی صحبتوں میں ساتھ رہنے لگے۔

وہ اسرائیلی مغنیہ بھی اکثر محفلوں میں شریک ہوتی تھی۔ اس طرح میں نے تھوڑے دنوں میں بہت سا روپیہ ضائع کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ کیفیت ہوئی۔ کہ جس قدر زر نقد میرا خسر چھوڑ گیا تھا۔ سب صرف ہو گیا صرف مکان ہی مکان رہ گئی اسکی حالت بھی بہت خراب تھی۔ مجھے عیش و عشرت میں مصروف پا کر کارندوں نے دست تغلب دراز کیا۔ اور بہت سا مال چپکے چپکے بیچ کے سارا روپیہ خورد برد کر گئے۔ جب یارانِ بزم نے دیکھا۔ کہ اب اس میں ہماری فرمائش پوری کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ تو وہ بھی آہستہ آہستہ سرکنے لگے۔ کچھ دنوں میں یہ حال ہوا۔ کہ اگر اُن میں سے

کوئی مجھے راستہ میں مل جاتا۔ تو منہ پھیر لیتا تھا +

دوستوں کی اس بے وفائی نے میرے دل پر بڑا اثر کیا۔ ایک دن گھر کا جائزہ لیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ ابھی کچھ زیور باقی ہے۔ اُسے فروخت کر کے میں نے دکان کی اصلاح کیطرف توجہ کی۔ خائن کارندوں کو علیحدہ کر دیا۔ اور دوکان کا سارا کام کاج کرنے لگا۔ اگرچہ میری پہلی سی حالت نہیں رہی تھی لیکن اب بھی دوکان کی حالت ایسی تھی۔ کہ میں باطمینان تمام زندگی بسر کر سکتا تھا۔ میرے رفیقانِ دیرینہ کو یہ بات معلوم ہوئی۔ تو اُنہوں نے پھر مجھ سے راہ و رسم پیدا کرنی چاہی۔ لیکن میں نے اُن میں سے کسی کو منہ نہ لگایا۔ اور کتب سیر و تاریخ کے مطالعہ سے اپنا جی بہلانے لگا۔ اِن کتابوں میں "الف لیلۃ" دلیلہ بھی تھی۔ کہ دانائی اور حکمت کا خزینہ ہے۔ اس کتاب میں مجھے بغداد کے ایک سوداگر زادہ ابوالحسن کا ماجرائے عجیب نظر آیا۔ جس نے اپنی تمام دولت دوستوں کی نذر کر دی۔ اور پھر ہارون الرشید اور زبیدہ خاتون کی مرحمت کی بدولت عسرت کی زندگی سے نجات پا کر مقربین بارگاہ خلافت میں شامل ہوا۔ اور اپنی مراد کو پہنچا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کہ ابوالحسن کی زندگی کے واقعات میری داستانِ حیات سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

اور جو جو معاملات اُسے پیش آئے تھے۔ وہ سب مجھ پر گزر چکے ہیں۔ میں یہ قصہ بار بار پڑھتا تھا۔ لیکن طبیعت کو سیری نہیں ہوئی تھی۔ آخر میرے دل پر اُس کا ایسا اثر ہوا۔ کہ میں خود کو سچ مچ ابوالحسن سمجھنے لگا +

ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا۔ کہ بغداد کے لوگوں نے جو سلوک ابوالحسن سے کیا تھا۔ وہی اُنہوں نے مجھ سے روا رکھا ہے۔ کیوں نہ میں بھی اُسکی طرح ہر رات کسی اجنبی کو اپنا مہمان بنا کے علی الصباح اُسے رخصت کر دیا کروں۔ اور اہلِ بغداد سے کوئی سروکار نہ رکھوں۔ چنانچہ میں نے اُسی دن اِس تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور سرِ شام اپنے خادم کو بلا کر کہا۔ کہ آج رات کے کھانے پر میرے ساتھ ایک مہمان بھی ہوگا۔ اور وہ رات بھی یہیں بسر کرے گا۔

میں دجلہ کے پل پر پہنچا۔ تو گاڑی اسٹیشن پر آچکی تھی۔ اور مسافر پُل کو عبور کر کے شہر کو آرہے تھے۔ اُن میں مختلف قسم کے لوگ تھے۔ کچھ فرنگی ارمنی اور یہودی تھے۔ کچھ ہندوستانی زائر۔ ایک گروہ مصری طلبا کا تھا۔ جو عراق کے آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے لئے آئے تھے۔ اور بغداد کے اخبارات میں کئی دن سے اُن کے متعلق چھپ رہی تھیں۔ لیکن مجھے

اُن میں سے کسی کو مخاطب کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ جا چکے۔ تو عمان بحرین اور سواحل عرب کے تاجروں کا ایک گروہ آیا۔ میری دلی آرزو تھی۔ کہ ان میں سے کسی کو اپنا مہمان بناؤں۔ مگر تقریب کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے تھے اور میں بار بار یہ سوچ کر رک جاتا تھا۔ کہ خدا جانے یہ لوگ میری عجیب وغریب استدعا سُن کر کیا کہیں۔ اصل میں کسی اجنبی کو اپنے ہاں رات بسر کرنے کی دعوت دینا بہت مشکل کام ہے۔ بغداد کا یہ سوداگر زادہ ابوالحسن بہت دلیر اور باہمت آدمی ہوگا۔ جو ہر رات ایک نئے شخص کو اپنا مہمان بنالیتا تھا +

تھوڑی دیر میں پُل بالکل خالی ہوگیا۔ اب صرف دو مسافر باقی رہ گئے تھے۔ اُن میں سے ایک ادھیڑ عمر کا دراز قد شخص تھا۔ اگرچہ اُس نے اپنی وضع سوداگروں کی سی بنا رکھی تھی۔ لیکن وہ اپنی سیاہ اور روشن آنکھوں کشادہ پیشانی۔ اور پُرتمکنت چال ڈھال سے کوئی عالی خاندان شخص معلوم ہوتا تھا۔ دوسرا ایک حبشی خادم تھا۔ جو ایک بکس اور دو کمبل اُٹھائے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اُسے دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا۔ کہ یہ شخص مقرر خلیفہ ہارون الرشید ہے۔ اور یہ حبشی اُس کا خادم مسرور۔ مگر مجھے

اپنے اس خیال پر خود ہی ہنسی آگئی۔ کیونکہ خلیفہ ہارون الرشید کو وفات پائے پورے گیارہ سو سال ہو چکے تھے۔

مجھے حوصلہ تو نہیں پڑتا تھا۔ کہ اس شخص کے سامنے اپنا مدعائے دلی زبان پر لاؤں۔ لیکن پھر اس خیال سے دل کو تقویت ہوئی۔ کہ اگر اب بھی میں نے تامل کیا۔ تو آج کی رات بھی تنہائی میں گذرے گی۔ چنانچہ میں نے آگے بڑھ کر نہایت ادب سے کہا۔ کہ آفندیم اگر آپ آج کی رات اس خادم کے ہاں بسر کریں۔ تو میں بیحد ممنون ہونگا۔ یہ سن کر وہ مجھے گھور گھور کے دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ مجھے کوئی چور یا ٹھگ سمجھتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر میں اسکے شکوک دور ہو گئے۔ اور وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں میں نے اُسے اپنے دوستوں کی بے وفائی کی داستان مختصر طور پر کہہ سنائی اور اس طرح میری اس عجیب درخواست کی وجہ اسکی سمجھ میں آگئی +

رات کو طعام سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے مجھے اپنے حالات سنائے۔ وہ خود عمان میں پیدا ہوا تھا۔ اور موتیوں کی تجارت کرتا تھا۔ لیکن اب کئی سال سے وہ اور اُس کا چھوٹا بھائی موصل میں مقیم تھے۔ اُس نے زمانے کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ اور زنجبار شمالی انڈ

الجزائر طرابلس سوڈان وغیرہ ممالک کی سیر بھی کر چکا تھا۔ بحری قزاقوں اور بربڈ فرشوں کی کئی کہانیاں اُسے یاد تھیں جنہیں سُن کر رگوں میں خون کھولنے لگتا تھا۔ اِن میں سے طرابلس کے خیاط اور ہسپانیہ کی شہزادی کا قصّہ۔ دو عرب درویشوں اور لونے عطر فرش کی حکایت مجھے بہت پسند آئی۔ مگر وہ اپنے انداز و اطوار سے اسقدر شائستہ اور مہذب معلوم ہوتا تھا۔ کہ مجھے اُسکی باتوں پر جو ایک اکھڑ اور سپاہی منش آدمی کو ہی زیب دیتی ہیں۔ یقین نہیں آتا تھا۔ بلکہ بار بار خیال آتا تھا۔ کہ یہ شخص ہارون الرشید تو نہیں ہوسکتا۔ مگر کیا عجب ہے کہ شاہ فیصل نے ہارون الرشید کی پیروی میں یہ دھج بنا رکھی ہو۔ کیونکہ شاہ فیصل سے اُس کی صورت بہت ملتی جلتی تھی +

جب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی۔ تو میں نے کہا آپ آرام کر لیجیے میرا سر چکرا رہا ہے۔ میں سگار پینے کا عادی نہیں۔ لیکن آپ کے اصرار سے مجبور ہو گیا۔ یہ کہہ کر میں تو اپنے پلنگ پر جا لیٹا۔ اور وہ بھی اُٹھ کر دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا +

میں نے دیکھا۔ کہ میں ایوان خلافت میں ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھا ہوں جس میں الماس اور زبرجد کے نگینے جڑے ہوئے ہیں۔ میرا لباس مطلّا

مذہب ہے اور میرے عمامہ میں ایک لعل شب چراغ جگمگا رہا ہے۔ دفعتہً کنیزوں کا طائفہ نمودار ہوا وہ سب کی سب زرتار لباس پہنے ہوئے تھیں اور ان کے سروں پر زمرد کے نیم تاج تھے وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئیں۔ اور بربط بجا بجا کر ایک نشاط انگیز گیت گانے لگیں۔ پھر سو حبشی غلام جو سپید ریشم کا لباس پہنے اور سنہری پیٹیاں لگائے ہوئے تھے۔ سروں پر سنہری خوان رکھے ہوئے آئے۔ اور انہیں میرے سامنے رکھ کر دہنے بائیں ادب سے کھڑے ہو گئے +

اب شور سا ہوا اور ایک بونا جسکی رنگت آبنوس سے زیادہ سیاہ تھی۔ قلابازیاں کھاتا میرے سامنے آگیا۔ ایک کنیز نے جو سب سے زیادہ خوبصورت اور نازک اندام تھی۔ بڑھ کر اس بونے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور وہ دونوں مل کر عربی کے اشعار گانے لگے۔ جن میں خلیفہ بغداد کی عظمت و شوکت کا ذکر کیا گیا تھا۔ میں انہیں روک کر پوچھنے کو تھا۔ کہ تم کون ہو؟ اور مجھے یہاں کون لایا ہے؟ کہ ایک قہقہے کی آواز آئی۔ میں نے اچھی طرح آنکھوں کو مل کے دیکھا۔ تو وہ کنیزیں اور ملازم سب غائب تھے۔ اور میں اپنے مکان پر بستر پر پڑا تھا +

پہلے تو مجھے خیال آیا۔ کہ وہ موصلی سوداگر دروازہ کھول کے چلا گیا ہے

اور شیطان نے میرے کمرے میں داخل ہو کر میرے حواس پراگندہ کر دیئے
پھر میں نے سوچا کہ ابوالحسن کا بھی یہی خیال تھا۔ مگر آخر کار اُس کا خیال غلط
ثابت ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کہ خلیفہ ہارون الرشید یا شاہ فیصل نے مجھے
اپنے ایوانِ سلطنت کی ایک جھلک دکھا کے پھر مجھے اپنے گھر پہنچا
دیا ہے +

میں اُٹھ کے دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ
میرا خادم علی مدہوش پڑا ہے۔ اور اُس موصلی سوداگر اور اُس کے
خادم کا کوئی پتہ نہیں۔ اب میں نے اپنے مکان کا جائزہ لیا۔
تو معلوم ہوا۔ کہ گھر میں جتنی قیمتی چیزیں تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی نظر
نہیں آتی۔ میرے سرہانے چابیوں کا جو گچھا پڑا رہتا تھا۔ وہ بھی غائب
ہے۔ اُسی رات کو کسی نے میری دکان کھول کر سارے مال و اسباب
کا صفایا کر دیا +

جب میں نے پولیس میں رپورٹ کی۔ اور کہا۔ کہ رات کو شاہ فیصل
موصلی سوداگر کے لباس میں میرے ہاں مہمان تھے۔ . . . . . لیکن
میرا خیال ہے۔ کہ وہ شاہ فیصل نہیں تھے۔ تو سب ہنسنے لگے۔ اور انہوں

نے میری بات سُننے بغیر مجھے دیوانہ سمجھ کر نکال دیا ✦

یہ ہے وہ داستان جو میں نے اپنے ساتویں سفر میں کبڑے مصوّر کی زبانی سُنی۔ اور اُس سے نقل کی ارمنی طبیب نے جو ایک ٹانگ سے لنگڑا اور ایک آنکھ سے کانا تھا۔ اور اس ارمنی طبیب سے خود میرزا حسن تبریزی نے یہ قصّہ بیان کیا ✦

# اِس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا

اُس نے جہاز سے اُترتے ہی میری توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ اُس کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کرہ ارض کے ایک ایک گوشہ سے واقف ہے۔ اور بمبئی میں کئی سال کے بعد آیا ہے۔ اُس جیسا اور کریہ نظر شخص آجتک میری نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن اُسکی بدصورتی میں بھی ایک خاص قسم کی دلآویزی اور کشش تھی۔ اُسکے غیر تناسب خدوخال سیاہ رنگت اور بھدے جسم پر نظر پڑتے ہی انسان کو ناگواری کے احساس کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوتی تھی +

اُس کا نام شہریار تھا۔ وہ مجھ سے بہت جلد بے تکلف ہو گیا جب اُس نے گفتگو شروع کی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اُسکی آواز میں ایک خاص قسم کا سَر اور لوچ ہے۔ اور اُسکی باتیں سُن کر انسان کا دل خواہ مخواہ اُسکی جانب کھچا جاتا ہے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "عورتوں کے دل کا

بھید کوئی نہیں جان سکتا"۔

مجھے یہ سُن کر اُسکی طرف سے یک گونہ مایوسی ہوگئی۔ کیونکہ میں اس شخص سے جو بظاہر سیّاح معلوم ہوتا تھا۔ کوئی عجیب و غریب داستان سننا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اُس نے ایک ایسی بات کہہ دی۔ جو ہزاروں برس سے لوگ کہتے چلے آئے ہیں۔ کسی قدر توقف کے بعد وہ بولا "کیا آپ نے اورانما کا نام سُنا ہے"۔

میں نے جواب دیا۔ مجھے کچھ یاد تو پڑتا ہے۔ شاید کسی رقاصہ یا خوشبو کا نام ہے۔ وہ کہنے لگا۔ نہیں صاحب اورانما ایک شہر کا نام ہے۔ یہ شہر ایک ایسے ملک میں واقع ہے جس کے متعلق آپ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے اور اگر میں اُس کے حالات بیان کروں۔ تو آپ کچھ سمجھیں گے بھی نہیں بس اتنا سُن لیجئے۔ کہ اِس ملک کی حکومت ایک مطلق العنان فرمانروا کے قبضے میں ہے۔ اور وہاں جو جولانام ایک پودا بڑی کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اِس ملک میں آپ کے خادم کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے بھولنا ناممکن ہے۔

میں اس ملک میں پورے پندرہ سال رہا ہوں۔ میں وہاں کے حاکم کا مشیر تھا۔ اور وہ میرے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ میرے کہنے پر کبھی

وہ ہمسایہ سلطنتوں سے جنگ چھیڑ دیتا۔ اور کبھی محصول درآمد میں اضافہ کر دیتا تھا مجھے اثر و رسوخ صرف اپنی طاقت لسانی کے باعث حاصل ہوا ہے یہ صحیح ہے۔ کہ بدصورتی میں میں اپنی مثال آپ ہوں۔ مگر قدرت نے مجھے حسنِ بیاں اور لطف زباں عطا کر کے اس کمی کی تلافی کر دی ہے۔ میں بھی اس قوت کے بل پر سلطنتوں کو قرض لینے یا دینے پر آمادہ کر سکتا ہوں۔ سپاہی میری تقریر سن کر میدانِ جنگ کی پتھریلی زمین پر راتیں بسر کر لیتے ہیں۔ اور دم تک نہیں مارتے۔ مجھے تیغ زبان کے زور سے شورش فرو کرنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے۔ جنگ کے کتے میری سیٹی کی آواز سن کر لپکتے ہیں۔ اور امن کی فاختہ میرے ایک اشارے پر اپنے پر پھیلا دیتی ہے۔ جب مجھے پہلی مرتبہ دیکھتے ہیں۔ تو کانپ اٹھتے ہیں۔ لیکن جب میں زبان کھولتا ہوں۔ تو دس منٹ کے اندر اندر انہیں پوری طرح مسخر کر لیتا ہوں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ کوئی عورت مجھ ایسے شخص کو پسند کرے گی ؟

میں نے کہا "تاریخ میں ایسی مثالیں تو موجود ہیں کہ"

وہ قطع کلام کر کے بولا۔ معاف کیجئے۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ ذرا میری داستان سن لیجئے۔ تو آپ پر میرا مطلب واضح ہو جائے۔ یوسف میرا

ایک دوست تھا۔ اُس کے بال بھورے تھے۔ اور آنکھیں نیلی جو ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اگرچہ وہ حُسنِ مردانہ کا مکمل نمونہ تھا۔ لیکن اُسکی گفتگو میں کوئی کشش نہیں تھی۔ میری اور اُسکی دوستی کی وجہ بھی یہی تھی۔ کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ وہ جب میرے چہرے پر نظر ڈالتا۔ تو اُس کا دل اپنی وجاہت ظاہری اور حُسنِ مردانہ کے غرور سے بھر جاتا۔ اور جب اُسکے حلق سے چند بہیم سی آوازیں نکلتی تھیں۔ جنہیں وہ گفتگو سے تعبیر کرتا تھا تو مجھے اطمینان سا ہو جاتا۔ کہ خدا نے مجھے اچھی صورت نہیں دی۔ تو کیا ہوا زبان میں تو اثر بخشا ہے +

ایک مرتبہ مجھے شہر اوراتما میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس موقع پر یوسف بھی میرے ساتھ تھا۔ کیونکہ اُسے اِس ملک میں بہت سے تجارتی حقوق حاصل تھے۔ اور وہ کئی کارخانوں کا مالک تھا۔ ملک بھر میں میرے نام کی شہرت تھی۔ اخباروں میں میری تعریفیں چھپتی تھیں۔ اس لئے جب میں اوراتما پہنچا۔ تو لوگ مجھے دیکھنے کو ہر طرف سے اُمڈ آئے تھے۔ یوسف کو کسی نے پوچھا تک نہیں۔ اُنکے سب کے سر میرے سامنے جھک گئے میری زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ اُن کے نزدیک پوری لائبریری سے زیادہ قیمتی تھا +

دنیا میں ایسے آدمی بکثرت ہیں۔ جو ایسے موقعوں پر خصوصیت سے بناؤ سنگار کرتے ہیں۔ منہ پر غازے ملتے ہیں۔ رخسار پر مصنوعی تل بناتے ہیں۔ اور طرح طرح کے گلگونوں کے استعمال سے حسین بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ان کوششوں سے کیا حاصل۔ لوگ چکنے گالوں کو نہیں دیکھتے بلکہ چکنی چپڑی باتوں کی قدر کرتے ہیں۔ خدوخال کو کوئی نہیں پوچھتا خیال کی لطافت اور انداز بیان کی رنگینی سب کو گرویدہ کر لیتی ہے۔

ہاں تو میں آپ سے کہہ رہا تھا۔ کہ ایک دن میں اور یوسف اور اتما کے مشہور بک ہزار پایہ کی شہ نشین میں بیٹھے تھے۔ یکایک یوسف نے کہا "بھائی شہریار" اور اتما میں میں نے ایک حسین عورت دیکھی ہے جس کے حسن و جمال کی نظیر دنیا کے پردے پر کہیں نہیں مل سکتی +

میں نے کہا "کون"؟

وہ بولا "رئیس شہر کی بیٹی لیلیٰ۔ اُس نے مجھے بیک نظر اپنا گرویدہ بنا لیا۔ لیکن تم تو صورت شکل میں گینڈے سے کم نہیں ہو تمہیں ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے +

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ کہ خدا نے مجھے حسین نہیں بنایا۔

لیکن اُس نے مجھے فصاحت بخش کے اس کمی کی تلافی بھی کردی ہے +

یوسف کہنے لگا:" اسی لیئے میں اس معاملہ میں تمہاری مدد چاہتا ہوں"+

" میں تمہاری مدد کیسے کرسکتا ہوں ؟"

" اس ملک میں تم بڑے آدمی سمجھے جاتے ہو۔+"

" اور اس میں شک ہی کیا ہے میں بڑا آدمی تو ہوں +"

" اور مجھ سا حسین شخص دُور دور نہیں ملتا۔ اب سُنو یہ خاتون صرف شام کو گاڑی میں بیٹھ کے آتی ہے - اور میدان کا چکّر لگا کے واپس چلی جاتی ہے۔ یا تو اِس وقت کچھ خوش نصیب اُسکی ایک جھلک دیکھ لیتے ہیں۔ یا پھر کبھی کبھی وہ اپنے مکان کے دریچے میں بیٹھی نظر آجاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ ہم دونوں مل کے اس پری کو شیشے میں اُتاریں"+

لیکن وہ ہم دونوں میں سے کِس کی ہو کے رہے گی ؟+

یوسف بولا:" میری اور کِسکی ؟ لیلے جب سیر کرنے میدان میں نِکلتی ہے اور مجھے پھر بیٹھے دیکھتی ہے۔ مگر وہ میرے اصلی نام سے واقف نہیں۔ بلکہ مجھے شہریار سمجھتی ہے۔ دراصل میں نے خود اُسکی انا کے ذریعے اُسے اس غلط فہمی میں مبتلا کردیا۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری شہرت سیاست دانی

اور دانشمندی اور میری وجاہت اور حسن اگر ایک شخص میں جمع ہو جائیں تو دنیا میں کونسی عورت ایسی ہے۔ تو ایسے شخص کی بیوی بننا نہ چاہے۔ اس نے تمہارے کارنامے ایک ایک کر کے سنے ہیں۔ اور مجھے بار بار دیکھا ہے"

"لیکن یہ بیل کیونکر منڈھے چڑھے گی"

سنو لیلے کے مکان کے ساتھ ایک باغیچہ ہے۔ لیلے جس غرفہ میں راتوں کو اکثر آ کے بیٹھتی ہے۔ وہ اسی باغ میں کھلتا ہے۔ غرفہ کے ساتھ نارنگی کے پیڑ ہیں جن پر عشق پیچہ کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی یہاں کھڑے ہو کر لیلے سے باتیں کرے۔ تو اس کا چہرہ دریچہ سے بالکل نظر نہیں آئے گا۔ مگر ایک دوسرے سے بآسانی باتیں کر سکیں گے میں چاہتا ہوں۔ کہ رات کو تم وہاں چلے جاؤ۔ اور میری جگہ اس سے اظہار محبت کرو۔ وہ تمہارا چہرہ تو دیکھ نہیں سکے گی۔ اس لیے یہی سمجھے گی۔ کہ یہ وہی حسین شخص ہے۔ جسے میں روز میدان میں دیکھتی ہوں"

میں نے تھوڑی دیر تامل کرنے کے بعد اس سے کہا۔ کہ اچھا دوست! میں اس معاملہ میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ میری باتیں سن کر اس کے دل پر تمہاری محبت کا نقش اس قدر گہرا ہو جائے

گا۔ دنیا کا کوئی حادثہ اُسے مٹا نہیں سکے گا" رات کو یوسف نے مجھے ایک سیاہ لبادہ لا دیا۔ اُس میں سارا جسم لپیٹ کے لیلےٰ کے غرفے تلے جا کھڑا ہوا۔ مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ کہ کوئی ٹھنڈی سانسیں بھر رہا ہے ساتھ ہی شمع کی روشنی میں ایک سپید سی شکل نظر آئی۔ میں نے کوٹ کے کالر میں اپنا منہ چھپا لیا۔ اور تقریر شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وُہ میری آواز سُنتی ہے۔ بُت بن گئی ہے۔ کبھی کبھی وُہ ہاں یا نہیں کہہ دیتی تھی۔ یا پھر اپنے حُسن و جمال کی تعریف سُن کر کسی قدر بلند آواز سے کہتی تھی صاحب آپ مجھے بنا رہے ہیں + میں ایک گھنٹہ تک تقریر کرتا رہا۔ یہ تقریر کیا تھا۔ ایک مسلسل غزل تھی جس میں میں نے جی بھر کے اُس۔ کے جمال و رعنائی کی تعریف کی تھی۔ جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو اُس نے مجھے ایک سُرخ پھُول دیا۔ جو میں نے یوسف کے حوالے کر دیا +

تین ہفتے تک یہ کھیل یوں ہی جاری رہا۔ آخر ایک رات کو اُس نے میری بیوی بننا منظور کر لیا۔ میں نے آتے ہی یوسف کو یہ مژدہ سنایا۔ اور ساتھ ہی اُس سے یہ بھی کہہ دیا۔ کہ دیکھو فی الحال اس سے باتیں نہ کرنا کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ سارا کیا کرایا خاک میں مِل جائے +

دوسرے دن یوسف نے کہا۔ کہ آؤ ذرا میدان تک ہو آئیں۔ میں ابھی تک وہاں نہیں گیا۔ کیونکہ کھیل تماشوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم جا کے کھڑے ہی ہوئے تھے۔ کہ دور سے ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ ساتھ ہی یوسف نے کہا۔ کہ میری لیلےٰ آ رہی ہے۔ میں نے لیلےٰ کے باغ میں تو بہت سی راتیں گزاری تھیں۔ لیکن ابھی تک اُسے نہیں دیکھا۔ اب جو میں نے چہرہ پر نظر ڈالی۔ تو ایسا محسوس ہوا۔ کہ میرے قدموں تلے سے زمین نکلی جا رہی ہے۔ کیونکہ میں نے عمر بھر ایسی حسین عورت نہیں دیکھی تھی۔ میں نے اُسی وقت تہیہ کر لیا۔ کہ جس طرح بن پڑا اس عورت کو اپنا بنا کے رہوں گا۔ مگر جب اپنی شکل و صورت کا خیال آیا۔ تو دل ڈوبنے لگا +

لیلےٰ کی گاڑی آہستہ آہستہ ہمارے پاس سے گزر گئی۔ لمحہ بھر کے لئے اُس نے اپنی سیاہ آنکھیں اٹھائیں۔ اور یوسف کے چہرے پر گاڑ دیں۔ یوسف کہنے لگا "شہریار"! اس خاتون کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔؟

میں نے جواب دیا "میں نے اُسے اپنی بیوی بنانے کا تہیہ کر لیا ہے"

یہ سُن کر یوسف اتنا ہنسا کہ اُسکے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ پھر کہنے لگا "ذرا آئینہ پر اپنی شکل تو ملاحظہ فرمایئے۔ اس وضع قطع پر آپ کو یہ اُمید ہے کہ لیلےٰ آپکی بیوی بننا قبول کر لیگی"

میں نے کہا "میں بحث میں تمہیں پڑنا چاہتا۔ مگر تم کان کھول کے سُن لو۔ کہ لیلےٰ عنقریب میری بیوی بننے والی ہے" اُس شام کو میں لیلےٰ کے والد سے ملا۔ اُس نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور میری بڑی خاطر مدارت کی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے کہا۔ صاحب! میں نے آپ کی صاحبزادی کے حُسن و جمال اور قابلیت کی بڑی تعریف سُنی ہے اگر آپ اُن سے میرا تعارف کرا دیں۔ تو میں بہت ممنون ہوں گا"

لیلےٰ دیوار کے پاس کرسی پر بیٹھی تھی۔ اُس کا لباس سپید تھا۔ اور اُس کے بالوں میں موتی چمک رہے تھے۔ اور اتما کے حاکم نے مجھے اُس کے پاس لے جا کے نہایت موزوں الفاظ میں اُس سے میرا تعارف کرا دیا۔ جب اُس نے پہلی مرتبہ میرے چہرے پر نظر ڈالی۔ تو اُس کے ہاتھ سے پنکھا چھوٹ کر گر پڑا۔ بھویں تن گئیں۔ اور جسم میں کپکپی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ مگر میری آواز سُن کر وہ چونک پڑی۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ اُسے

میری آواز اور چہرے میں کوئی نسبت نظر نہیں آتی تاہم میں لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں رُکا۔ اور برابر باتیں کرتا چلا گیا۔ چپ چاپ کرسی پر بیٹھی تھی اور میں شاعری، مصوری۔ رومان۔ پھولوں اور چاندنی کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں میں نے عین وہ شعر بھی پڑھے۔ جو میں نے راتوں کو اُس کے دریچے کے نیچے کھڑے ہو کر اُسے سُنائے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ اور مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ اُس نے میری آواز پہچان لی ہے۔

غرض دو ہفتہ کے اندر اندر لیلےٰ سے میری نسبت پختہ ہو گئی۔ یوسف کو رنج تو بہت ہوا۔ لیکن اُس نے مردانہ وار اس صدمہ کو برداشت کیا۔ اور کہنے لگا "شہریار! میں ابھی مایوس نہیں ہوا"

ایک دن میں بہت دیر تک دھوپ میں گھومتا رہا۔ پھر سیدھا سمندر کے کنارے پہنچا۔ اور ٹھنڈے پانی سے غسل کر لیا۔ اُس شام کو میں لیلےٰ سے ملنے گیا۔ تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ کہ بولنا چاہتا ہوں۔ تو بولا نہیں جاتا چھینکیں آتی ہیں۔ اور حلق سے کچھ ایسی مہیم آوازیں نکلتی ہیں۔ جو خود میرے کانوں کو اجنبی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ عشق و محبت کی باتیں وہ شاعرانہ استعارے

اور شہیں سب ختم ہو چکی ہیں۔ دراصل مجھے زکام ہو گیا تھا۔ پانچ دن یونہی گذر گئے۔ چھٹے دن لیلے اور یوسف دونوں کہیں غائب ہو گئے۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا۔ کہ وہ دونوں ایک دُخانی کشتی پر بیٹھ کر بھاگ نکلے ہیں۔ میں نے ایک کشتی پر اُن کا پیچھا کیا +

چلنے سے پہلے مجھے خیال آیا۔ کہ زکام کی کوئی دوا خریدنی چاہیے۔ چنانچہ میں اِدراتما کے ایک بڈھے دوا فروش مینول کی دُکان میں جا گھسا بول تو سکتا نہیں تھا۔ اپنے گلے کی طرف اشارہ کر کے رہ گیا۔ اُس نے ایک جمائی لی۔ اور کچھ سوچنے لگا۔ مجھے جلدی تھی۔ اُسے گریبان سے پکڑ کر پھر اپنے گلے کی طرف اشارہ کیا۔ اُس نے گھبرا کر ایک شیشی جس میں کوئی سیاہ رنگ کی رقیق دوا تھی۔ میرے حوالے کر دی۔ اور کہا کہ دو دو گھنٹے کے بعد چمچہ بھر دُوائی لینا۔ میں نے ایک روپیہ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور بندرگاہ کی طرف بھاگا +

دونوں کشتیاں آگے پیچھے کنارے پہنچیں۔ لیلے اور یوسف دونوں ساحل پر کھڑے تھے۔ لیلے نے مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ اور پھر اِسکی آنکھیں یوسف کے حسین چہرے پر جم گئیں۔ مجھے معلوم تھا۔ کہ میں بول نہیں سکتا لیکن

میری کامیابی کا انحصار صرف بولنے پر تھا کسی نہ کسی طرح پھیپھڑوں پر زور ڈال کے آواز نکالنا چاہیئے۔ مگر جب میں نے بولنا چاہا۔ تو مجھے کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ میری آواز پہلے سے زیادہ بلند اور شیریں تھی۔ ایک ایک لفظ صاف سنائی دیتا تھا۔ اور اُس میں دبے اور رُکے ہوئے جذبات موجیں مار رہے تھے +

میں نے کہا "لیلیٰ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا"+

میں اُسے ناریل کے ایک درخت تلے لے گیا۔ اور شیریں بیانی کے جادو سے چند لمحوں میں اُس کا دل موہ لیا۔ وہ میری باتیں سُن کر کہنے لگی۔ شہریار جب تم مجھ سے مخاطب ہوتے ہو۔ تو میں نہ کچھ سُن سکتی ہوں۔ اور نہ دیکھ سکتی ہوں۔ ساری کائنات تمہارے سوا مجھے کوئی چیز حقیقی معلوم نہیں ہوتی +

غرض لیلیٰ میرے ساتھ اور تما چلی گئی۔ اور تھوڑے دنوں میں ہمارا بیاہ ہوگیا۔ معلوم نہیں یوسف کا کیا حشر ہوا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے اُسے نہیں دیکھا۔

کیا یہ داستان سُن کر آپ اُکتا تو نہیں گئے"+

میں نے کہا۔ نہیں تو۔ مجھے نفسیاتی مسائل سے دلچسپی ہے۔ دراصل عورت کا دل عجیب چیز ہے +

شہریار کہنے لگا "اور حلق کی نالی اور پھیپھڑا بھی تو عجیب و غریب چیزیں ہیں۔ کیا آپ نے حنجرہ کی ساخت پر بھی کبھی غور کیا ہے +

نہیں صاحب" لیکن آپ کی داستان مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ کہیئے اب آپ کی بیگم صاحبہ کا کیا حال ہے؟"

"ہم ادراتما سے اُٹھ آئے ہیں۔ اور جادا کے قریب ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہتے ہیں۔ میری بیوی کو ادراتما کی آب و ہوا موافق نہیں تھی۔ خیر یہ ہوا۔ کیا آپ نے حلق کی رگوں کو الگ الگ کر کے دیکھا ہے +"

میں نے کہا ہے "مجھے فن جراحی سے کوئی دلچسپی نہیں +

وہ کہنے لگا "ہر شخص کو علم تشریح الاعضا سے کسی قدر واقف ہونا چاہیئے۔ زکام بڑا خطرناک مرض ہے۔ پرانے مشرقی طبیبوں نے اسے ام الامراض کہا ہے۔ اس سے پھیپھڑے کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اکثر اوقات نمونیا ہو جاتا ہے سل اور دق وغیرہ امراض بھی اسی سے پیدا ہوتے ہیں +

میں نے کسی قدر چڑھ کر کہا۔ لیکن اس واقعہ سے طب کو کیا تعلق میں تو عورت کے جذبات کا ذکر کر رہا تھا"۔

وہ کہنے لگا" تو آپ نے سارا واقعہ سنا نہیں جب میں واپس ورانما گیا۔ میں نے اُس بڈھے دوا فروش سے پوچھا۔ تم نے مجھے کیا دوا دی تھی۔ وہ کہنے لگا۔ کہ میں یہ دوا چرچلا بوٹی کے عرق سے طیار کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر شہریار نے اپنی جیب سے ایک بکس نکالا۔ اور کہنے لگا۔ چرچلا بوٹی صرف ورانما اور اُس کے آس پاس کے پہاڑوں میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ دوا جو اس بوٹی کے رس اور چند دوسری ادویہ کا مرکب ہے۔ کھانسی زکام۔ نزلہ اور حلق اور پھیپھڑے کے اکثر امراض میں تیر بہدف ثابت ہوئی ہے۔ میں بمبئی اس لئے آیا ہوں۔ کہ اخبارات میں اُس کا اشتہار دوں۔ اور ہندوستان میں اسکی فروخت کا انتظام کروں۔ فی الحال میں اسے ٹکیہ کی صورت میں فروخت کرتا ہوں۔ اس ڈبے میں چالیس ٹکیاں ہیں۔ جن کی قیمت صرف تین روپے ہے۔ اگر آپ کے حلق میں خراش سی رہتی ہے۔ رات کو کھانسی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی زکام ہو جاتا ہے۔ نزلہ کی وجہ سے قبل از وقت بال سپید ہو گئے

ہیں۔ سر چکراتا ہے۔ کھانا اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا۔ مضمون لکھتے لکھتے
آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ تو آپ یہ دوا استعمال کریں۔ خدا نے
چاہا۔ تو چند دنوں کے اندر تمام امراض کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دے
گی۔ اگر آپ کو گانے یا تقریر کرنے ـــــــ ئیں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور
کچھ کہے بغیر گھر کی طرف چل پڑا ۔

# الف لیلےٰ کا نائی

نائی شاہ جہان پور کے ہوں یا نگینہ کے لاہور کے ہوں یا امرتسر کے سب کے سب باتونی ضرور ہوتے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے۔ کہ کسی کی زبان قینچی کیطرح چلتی ہے کسی کی اُسترے کیطرح۔ کسی کی باتوں میں بُرش کی سی نرمی ہے۔ کسی کی گفتگو میں نشتر کی سی تیزی۔ کوئی صرف الفاظ کی حجامت کرتا ہے۔ کوئی بال کی کھال اُتارتا ہے +

میرے دوست چودھری علی محمدؐ ان باتونی نائیوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں وہ حق بجانب بھی ہیں۔ کیونکہ اُن کا نائی جس کے خاندان میں سولہ پشت سے "حجامی" یا یوں کہیئے "کہ خلافت" چلی آتی ہے۔ اسیطرح اُن کا مزاج شناس ہے جسطرح اُسکے باپ دادا چودھری صاحب کے آباؤ اجداد کے مزاج شناس تھے۔ جہان خط بناتے بناتے اُسترا شہرگ کے قریب پہنچا۔ خلیفہ نے کہا" چودھری ابھنیس کے لئے گھاس چاہیئے

چودھری ہمارا اس حالت میں انکار کرنے سے تو رہا۔ چہرے پر مسکراہٹ کے آثار پیدا کرنے کی ایک ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا "سے جا لیو؟" خلیفہ نے پانی سرتا دیکھ کر پاؤں لپیا رے اور کہنے لگا۔ چودھری! اب کے دھان سے ہمیں کوئی حصّہ نہیں ملا۔ چودھری بولے "ملے گا ضرور ملے گا۔" غرض خلیفہ نے خط بناتے بناتے ہمارے چودھری کو مونڈ لیا۔

میں نائیوں سے کبھی نہیں ڈرا تھا۔ لیکن پارسال ایک ایسا واقعہ ہوا۔ جس نے اُن کی ہیبت میرے دل پر بٹھا دی۔ شام کا وقت تھا۔ اور میں ایک دعوت میں شریک ہونے جا رہا تھا۔ پن اسٹریٹ سے آگے بڑھا تو سامنے ایک نائی کی دوکان نظر آئی جس پر بغداد ہیر کٹنگ سیلون لکھا تھا۔ میں نے دو دن سے حجامت نہیں بنوائی تھی۔ نائی کی دوکان دیکھ کر میرا بایاں ہاتھ بے اختیار ٹھوڑی پر پہنچ گیا۔ اور میں نے جی میں کہا۔ کہ یہ حجام بھی طبیعت دار آدمی معلوم ہوتا ہے جس نے اپنی "خلافت" کی رعایت سے دکان کا نام بغداد ہیر کٹنگ سیلون تجویز کیا ہے۔ لاؤ اس سے دو منٹ میں حجامت کیوں نہ بنوا لیں؟

مجھ سے پہلے دوکان میں صرف ایک لمبے قد اور چوڑے ہاڑ کا آدمی

بیٹھا خط بنوا رہا تھا۔ اُس کے بڑے بڑے گلچھے اسطرح معلوم ہوتے تھے۔ جیسے کنویں کی جگت پر آرپار دو کوّے بیٹھے ہوں۔ خلیفہ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ تشریف رکھیئے میں ابھی فارغ ہوا جاتا ہوں +

یہ حجام چھوٹے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ میری طرف تو اُسکی پشت تھی۔ لیکن آئینے میں اُس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس کے گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئیں خط بنانے سے فارغ ہو کر اُس نے میری طرف توجہ کی۔ اور کہنے لگا۔

"فرمایئے آپ بال کٹوائیں گے۔ یا صرف ڈاڑھی منڈوائیں گے؟"

میں نے جواب دیا "بال تو پھر کبھی کٹواؤں گا۔ اِس وقت مجھے صرف ڈاڑھی منڈوانا ہے +"

آپ کی ڈاڑھی کے بال ذرا سخت معلوم ہوتے ہیں۔ اور میں حجامت میں ہمیشہ اصولِ فن کو مدِ نظر رکھتا ہوں۔ اِس لئے ڈاڑھی مونڈنے میں ذرا دیر تو ضرور لگے گی۔ لیکن حجامت ایسی ہوگی۔ کہ گھنٹہ بھر کھونٹی ٹٹولتے رہیئے اور سُراغ تک نہ ملے۔ اصل میں یہ فن ایسا آسان نہیں۔ کہ جس کسی کو استرہ پکڑنا آ گیا۔ حجّام بن بیٹھا۔ میاں حجّام کوئی کوئی ہوتا ہے۔ ورنہ جو لوگ کسوت

بغل میں دابے پھرتے ہیں۔ اور حجام۔ اور خلیفہ اور خدا جانے کیا کیا کہلاتے ہیں۔ گھسیارے ہیں گھسیارے۔ دراصل گھسیارے اور حجام کھرپے اور استرے میں بڑا فرق ہے۔ مگر اس فرق کو وہی لوگ سمجھتے ہیں۔ جنہیں اللہ نے سوجھ بوجھ دی ہے۔ یہ کہہ کے اس نے اپنے نائب کو اشارہ کیا۔ وہ برش لے کے میری طرف بڑھا۔ حجام استرا تیز کرنے لگا + پھر وہ استرا تیز کرتے کرتے بولا:" آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے پچھواڑے جو ہوٹل ہے۔ وہاں کل رات ایک خون ہو گیا۔ سنا ہے لکھنؤ کے ایک نوجوان سیٹھ کو کسی ظالم نے چھری بھونک کر مار ڈالا۔ مقتول کی نوجوان بیوی اس کے ساتھ تھی۔ وہ کہتی ہے کہ آدھی رات کو کسی نے ہمارے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرا شوہر باہر نکلا باہر کوئی آدمی کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔ کچھ دیر دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھے اپنے شوہر کی چیخ سنائی دی۔ اور ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا۔ کہ کچھ لوگ بڑے زور سے بھاگ رہے ہیں + میں نے خود لاش دیکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک ہی وار میں آنتیں باہر نکل آئیں۔ اور مقتول تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اور عجیب بات یہ ہے۔ کہ جس کرسی پر آپ بیٹھے ہیں۔ ابھی دو دن ہوئے۔ ہمارا سیٹھ یہاں بیٹھا ہنس

ہنس کر مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ سُن کر میرے سارے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ حجام نے اُسترا میری کنپٹی پر رکھ دیا۔ اور کہنے لگا۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ جس عمارت میں یہ ہوٹل ہے۔ اُس میں بھوتوں کا بسیرا ہے۔ اکثر لوگوں نے رات کے وقت ایک سیاہ پوش کو پھرتے دیکھا ہے۔ اُس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے۔ اور اُس سے تازہ خون بہتا نظر آتا ہے۔ دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے جسے وہ گھماتا ہوا ہوٹل میں سے گزرتا ہوا چلا جاتا ہے +

یہ کہتے کہتے خلیفہ نے اُسترے کو اسطرح گھمانا شروع کیا۔ کہ میں سہم گیا۔ تھوڑی دیر وہ چُپ چاپ حجامت کرتا رہا۔ پھر کہنے لگا "کبھی آپ نے سوچا ہے۔ کہ اگر کوئی نائی حجامت کرتے کرتے پاگل ہو جائے تو کیا ہو؟ دیکھئے نا اس وقت استرہ آپ کے حلق پر ہے۔ اگر میں چاہوں تو ــــــــــ" یہ کہہ کر اُس نے اس طرح میری طرف دیکھا۔ کہ میرے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی +

وہ داڑھی مونڈ چکا۔ تو کہنے لگا۔ اب ذرا آئینہ میں اپنی صورت ملاحظہ فرمایئے۔ اور میری ہنرمندی کی داد دیجئے۔

میں تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ کڑک کے کہا "بھاڑ میں گئے تم اور

تمہاری ہنرمندی ؟"

وہ بولا "کیا ہوا ؟"

میں نے کہا "چہ خوش ۔ ابھی کچھ ہوا ہی نہیں ۔ تم سے یہ جنون بھوتوں کی کہانیاں اور قتل و خون کے قصے سنانے کو کس نے کہا تھا" وہ کہنے لگا "اچھا تو آپ میری باتیں سن کر پریشان ہو گئے ۔ حالانکہ میری ہنرمندی استرے کی باڑھ میں نہیں ۔ انہیں باتوں میں ہے ۔ آپ نے اتنا تو سنا ہوگا ۔ کہ خوف و دہشت کے عالم میں انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ یہ کوئی دور از کار خیال نہیں ۔ بلکہ اس میں بہت حد تک واقفیت ہے ۔ بلکہ میرا تو تجربہ ہے ۔ کہ جب انسان پر ہیبت و دہشت کی کیفیت طاری ہوتی ہے ۔ تو اس کے جسم کے تمام بالوں میں ایک تناؤ سا پیدا ہو جاتا ہے ۔ ایک حجام کے نقطۂ نظر سے یہ تناؤ بہت مفید ہے کیونکہ اس حالت میں وہ بآسانی حجامت بنا سکتا ہے ۔ اگر میں آپ کو یہ قصے نہ سناتا ۔ تو آپکی ڈاڑھی کیسے مونڈ سکتا اور مونڈھ بھی لیتا ۔ تو جلد جگہ جگہ سے چھل جاتی ۔ ذرا آئینہ تو دیکھئے ۔ کہیں کوئی ہلکی سے ہلکی خراش بھی تو نہیں ۔ درحقیقت آپ کو آج تک کسی تعلیم یافتہ اور روشن خیال نائی سے واسطہ نہیں پڑا ۔

بہرحال اگر آپ کو میری باتوں سے کسی قدر تکلیف ہوئی ہے۔ تو اُس کے لیئے میں معافی کا خواستگار ہوں۔

اُسکی یہ توجیہہ سُن کر میرا غصہ کسی قدر کم ہو گیا۔ اور میں نے کہا "تم نے اپنی دوکان کا نام "بغداد ہیر کٹنگ سیلون" کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ کہنے لگا "میرے باپ دادا بغداد سے آئے تھے۔ اور ہمارے خاندان میں یہ فن کوئی ہزار سال سے چلا آتا ہے۔ آپ نے الف لیلہ میں بغداد کے ایک نائی کا حال پڑھا ہوگا۔ میرا سلسلہ نسب اسی شخص سے ملتا ہے ؎

# ایک تھا راجہ

ٹھیٹھ اردو میں ایک کہانی

ایک تھا راجہ اور ایک تھی اس کی بیٹی۔ جسے سب لوگ ارملا کر کے پکارتے تھے۔ اس راجکماری سے کوئی ایسی بھول ہوئی۔ کہ راجہ نے اس کا بیاہ کرنے کی ٹھان لی اور اچھی گھڑی دیکھ کر سویمبر کا ڈول ڈال دیا۔

سویمبر کے دن راجہ ہتھیار بند سر پر مکٹ رکھ راج سنگھاسن پر آ بیٹھا۔ سنگھاسن کے دہنے بائیں کھشتری ہتھیار لگائے اور برہمن پوتھیاں لئے کھڑے تھے اور راجکماری ارملا ہاتھوں میں مہندی رچائے اور آنکھوں میں کاجل لگائے راجہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے بھونرا سے

---

سلہ اس کہانی میں عربی فارسی الفاظ عمداً نہیں لائے گئے۔

بال تھے۔ بڑی بڑی مدھ بھری آنکھیں۔ ہونٹ ایسے جیسے لال پھولوں کی دو پتیاں جاڑے کی رات میں کانپ رہی ہوں۔ جو بڑے بڑے سُورما اور گھُڑچڑھے راجکماری کو جیتنے آئے تھے۔ وُہ اُسے دیکھ کر بھونچکارہ گئے اور جی ہی جی میں کہنے لگے۔ کہ یہ ہاتھ لگے تو جینے کا سہارا ہو جائے۔ سدا راجہ کے ساتھ رہیں اور سانجھ سویرے مال پورے اور پوریاں کچوریاں اڑائیں

ان لوگوں میں ایک لڑکا بھی تھا جو گسائیں گردھر سوامی جی مہاراج کے پاس پڑھا کرتا تھا۔ تھا تو وہ کسی کنگلے کا بیٹا۔ پر اس کے جوبن میں ایسی جوت تھی کہ راجکماری کے جی کو آٹھ پہر اسی کی لگن رہتی تھی۔ اُسے دیکھ کر راجکماری کے جی کی بیکلی آپ سے آپ جاتی رہی۔

اتنے میں راجکماری کو بھوک لگی اور وہ دہی بڑے کھانے لگی۔ بڑے کھاتے کھاتے نہ جانے کیا بات اس کے جی میں آئی کہ وہ مُسکرا پڑی اور اس کے موتیوں جیسے دانتوں کی چمک سے آس پاس اُجالا سا ہوگیا۔ یہ دیکھ کر سارے سُورما راجہ کے مودی کے پاس پہنچے اور اپنا اپنا اپنے گھوڑوں کا خرچ لیکر گھروں کو چلے گئے۔ ہاں دو سُورما ابھی تک گھوڑے کدا کدا کر اپنے اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ ان دونوں میں ایک تو وہی لڑکا

تھا۔ جس میں راجکماری کا دھیان لگا رہتا تھا۔ اور دُوسرا ایک اور گھوڑا جو کسی دیس سے آیا تھا

وہ دونوں پُورے دو گھنٹے لڑتے رہے اور جتنے داؤں اُنہیں آتے تھے سب خرچ کر ڈالے اب سورج چھپنے کو تھا اور اس کی لال لال کرنوں میں سنہری روپہلی گوکھرو جنہیں پیڑوں میں ٹانک دیا گیا تھا اور اُودے اور پیلے بادلے جو اٹاریوں پر لہراتے تھے اپنی چمک دمک دکھا رہے تھے۔ دونوں سورماؤں کا سانس پھولا ہوا تھا اور ایسا دکھائی دیتا تھا۔ کہ اب یہ دونوں نڈھال ہو کر گر پڑیں گے۔ ایکا ایکی اس لڑکے نے گھوڑے کو ڈپٹ کر دوسرے سورما کی چھاتی پر یوں بھالے کی چھڑ ماری کہ وُہ دھرتی پر آ رہا۔ اور سب کے مُنہ سے واہ واہ نکل گیا۔ یہ دیکھ کر راجکماری کے گال تمتما اُٹھے۔ اور اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

راجہ نے کہا "میرے راج میں جو کچھ ہے آج وہ سب میں تجھے دے سکتا ہوں۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔

لڑکا بولا "مہاراج مجھے کچھ ایسا لکھ دیجئے کہ آپ کے دیس میں جتنا مٹی کا تیل ہے مجھ چھوٹ کوئی دُوسرا اسے نہ نکال سکے"۔

راجہ کہنے لگا "ہاں دو سال ہوئے سمندر پار کے کسی دیس کے لوگ یہاں آئے تھے اور کہتے تھے کہ اس دیس میں جگہ جگہ مٹی کا تیل ہے وہ بھی یہی بات چاہتے تھے۔ جو تم چاہتے ہو پر ان کی بات جھوٹ نکلی اور وہ اپنے دیس کو چلے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے راج میں کہیں بھی مٹی کا تیل نہیں۔"

یہ سُن کر وہ لڑکا پہلے راجہ کا مُنہ تکتا رہا اور پھر "بڑا دھوکا ہوا" کہہ کر گھوڑے کو ایڑ بتا آن کی آن میں سب کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا راجہ کچھ کہنے کو تھا۔ نہ جانے اُسے کیا ہوا کہ وہ بے سُدھ ہو کر دھرتی پر گر پڑا اور پھر چلّا کے کہنے لگا "ارے وہ تو ارملا کو یہیں چھوڑ کر چلا گیا۔"

(اوہنری کے تتبع میں)

# بھینس

بھینس کے متعلق یہ عام خیال ہے کہ یہ جانور شعریت سے قطعاً معرّا ہے۔ سیاہ رنگت۔ بے ڈھنگا جسم۔ بھدی اور بے ہنگم آواز۔ اور پھر رفتار خدا کی پناہ۔ یوں تو ہتھنی بھی جھوم جھوم کے چلتی ہے۔ لیکن اس کی چال میں ایک قسم کی مستی ہے۔ اور بھینس میں یہ بھی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ بھاشا کے شاعروں نے محبوب کی رفتار کو ہتھنی کی چال سے تشبیہ دی ہے لیکن بھینس کو اس موقعہ پر بھی یاد نہیں کیا۔

موسیقی کا اثر انسان اور حیوان سب پر ہوتا ہے اونٹ حدی کی آواز سُن سُن کر تیز چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور پرندوں کو تو گانے بجانے کی دھت ہے۔ بندر خود تو نہیں گاتے۔ البتہ انسانوں کا گانا سُن کے ضرور خوش ہوتے ہیں۔ گھوڑے قرنا کی آواز پر سیخ پا ہوتے ہیں۔ اور تو اور ہم نے گایوں اور بکریوں کو بھی راگ سُن کر سر ہلاتے دیکھا ہے لیکن بھینس کے

متعلق سب کی رائے یہی ہے کہ اس جانور پر نہ شاعری کا اثر ہوتا ہے نہ موسیقی کا۔ خواہ آپ اُسے جوش کا کلام سنائیے یا وارث شاہ کا۔ بین بجائیے یا ہارمونیم۔ کیا مجال جوٹس سے مس ہو جائے۔ سر شہاب الدین پنجابی زبان میں شعر بھی کہتے ہیں۔ اور بھینس بھی پالتے ہیں۔ لیکن آج تک وہ کسی بھینس کو اپنی شاعری سے متاثر نہیں کر سکے۔ حالانکہ نواب احمد یار خاں دولتانہ نے ان کا کلام سُن کر بارہا داد دی ہے۔

با ایں ہمہ شاعر حضرات مایوس نہیں ہوئے اور ان میں بھینس پالنے اور ان میں شاعری کا مذاق پیدا کرنے کا شوق بہت ترقی کر رہا ہے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری جالندھر کی شعر نواز سرزمین سے ایک بھینس خرید لائے ہیں۔ جسے وہ ہر روز "جاگ سوز عشق جاگ" پڑھ کر سناتے ہیں۔

ملا رموزی بھینس کو شعر سناتے سناتے خود شاعر بن گئے۔ مگر اب تک ان کی بھینس سوزِ عشق سے بالکل خالی ہے۔ صدفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم نے پچھلے دنوں بھینس خریدی ہے اور اس کے سامنے روز اپنا مشہور گیت "تم آسمان کی طرف نہ دیکھو" حضرت حفیظ جالندھری کے

انداز میں گاتے ہیں۔ اب تک صرف اتنا ہوا ہے کہ جب وہ گیت گانا شروع کرتے ہیں۔ تو ان کی بھینس گردن اُٹھا کے آسمان کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔

سر شہاب الدین پر اس قسم کے سانحے گذر چکے ہیں کہ بھینس شعر سنتے سنتے رسّہ تڑا کے بھاگی اور جوار کے کھیت میں جا کے دم لیا۔ کھیت کے مالک نے دُور سے دیکھا۔ اور ڈنڈا لے کے بھاگا۔ ادھر سے بھینس کا مالک بھی "ہائے میری بھینس" کے نعرے لگاتا پہنچا اور اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اسی قسم کے ایک موقع پر سر شہاب الدین نے ایک نظم لکھی تھی جو ان کی پہلی اور آخری اُردو نظم ہے۔ ٹھیک ٹھیک یاد نہیں کچھ اس قسم کے اشعار تھے۔

میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا

وہ تو کھیت میں چرنے آئی تھی　　پیٹ اپنا بھرنے آئی تھی
کب لڑنے مرنے آئی تھی　　میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا

میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا

مصیبت تو یہ ہے کہ بھینس کو ڈنڈے سے گہرا تعلق ہے۔ سب یہی کہتے ہیں کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ جس کے اشعار اس کی

بھینس۔ اس لئے اس قسم کے جھگڑوں میں ہمیشہ لاٹھی والے کی فتح ہوتی ہے۔ اور بیچارا شاعر بھینس اور لاٹھی دونوں کا مُنہ تکتا رہ جاتا ہے

---

حاجی لق لق پر پچھلے دنوں بھینس کے ہاتھوں قیامت گزر گئی۔ یہ تو اکثر لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ حاجی صاحب نے کوئی سال بھر سے ایک بھینس پال رکھی ہے اور اس کی خدمت اس تندہی سے کرتے ہیں کہ کوئی اس طرح بزرگوں کی خدمت بھی کیا کرے گا؟ اگرچہ حاجی صاحب خود "بیچارہ" ہیں۔ مگر بھینس کیلئے چارہ فراہم کرنے میں ان سے کبھی کوتاہی نہیں ہوئی لیکن پچھلے دنوں خدا جانے اس بھینس کے جی میں کیا آئی کہ رسّہ تڑا کے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور جوار کے کھیت سے بخطِ مستقیم کانجی ہؤس جا پہنچی حاجی صاحب دِلّی گئے ہوئے تھے۔ آتے ہی یہ واقعہ سُنا۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اور مُنہ سے بے اختیار نکل گیا ؎

الٰہی مری بھینس کی خیر ہو

ہوش ٹھکانے ہوئے۔ تو کانجی ہوس پہنچے اور بھینس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ کانجی ہوس والوں نے کہا "صاحب! کانجی ہؤس

کے قوانین بورسٹل جیل کے قاعدوں سے زیادہ سخت ہیں بھینس سے ملنا ہے تو درخواست دیجئے۔ ہم اسے مسٹر میکناب (افسر اعلیٰ لاہور میونسپلٹی) کے پاس بھیجدیں گے۔ وہ چاہے اجازت دیں۔ چاہے نہ دیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ مجبور ہو کر درخواست لکھی اور مسٹر میکناب کے پاس بھیج دی۔ تیرہ دن گذر گئے۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔

وکیل سے مشورہ کیا تو اس نے کہا معلوم نہیں آپ کو بھینس سے ملاقات کی اجازت ملے یا نہ ملے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اجازت حاصل کرنے میں پورا سال صرف ہو جائے۔ اب جرمانہ ادا کر کے بھینس کو چھڑا کیوں نہیں لاتے؟ حاجی صاحب کو یہ بات پسند آئی چنانچہ جرمانہ ادا کرنے کیلئے نہ تو کوئی چندہ کی اپیل شائع کی۔ نہ لوگوں سے کہا کہ آپکی غیرت کے امتحان کا وقت آگیا ہے اور یہ فرمایا کہ پنجاب کی اتحادی وزارت نے مجھ سے انتقام لینے کے لئے میری عزیز از جان بھینس کو کانجی ہاؤس بھجوا دیا ہے بلکہ جرمانہ کی رقم جو غالباً پندرہ روپے ساڑھے سات آنے تھی۔ اپنی جیب سے ادا کر کے بھینس کو چھڑا لائے۔

سُنا ہے کہ بھینس کا جلوس بڑی دھوم دھام سے نکلا۔ اس کے

گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔ اور مصری شاہ کے گلی کوچوں میں "انقلاب زندہ باد"، "کانجی ہوس ہائے ہائے" اور "میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا" کے نعروں کے ساتھ اُسے پھرایا گیا۔ بھینس شاعر نہیں بن سکتی۔ شعر فہم نہیں بن سکتی۔ تو کیا ہوا۔ لیڈر تو بن سکتی ہے۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ حاجی لق لق کے خاندان میں اس بھینس کے سوا کبھی کسی نے قانون شکنی نہیں کی۔

---

بھینس کو شاعری سے اس لئے بھی کوئی تعلق نہیں کہ عقل اور شاعری میں ہمیشہ سے جنگ رہی ہے اور بھینس کا مقابلہ ہمیشہ عقل سے کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آج تک بڑے بڑے عالم یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ عقل بڑی ہے یا بھینس۔

بھینس کا طول و عرض حتیٰ کہ اس کا وزن تک لوگوں کو معلوم ہے۔ لیکن عقل کے حدود اربعہ کے متعلق ہی علماء میں اختلاف نہیں۔ بلکہ اس کے وزن کا مسئلہ بھی مشتبہ ہے اب تک صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ عقل اور علم کے وزن میں ایک اور دس کی نسبت ہے۔ اسے لئے کہتے

ہیں۔ کہ "یک من علم را دہ من عقل باید" علم کا وزن متعین ہو جائے۔ تو عقل کے وزن کا مسئلہ بھی طے ہو سکتا ہے اور عقل کا وزن معلوم ہو جائے تو اس متنازعہ فیہ مسئلہ کا فیصلہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ کہ عقل بھینس سے بڑی ہے یا بھینس عقل سے۔ بہرحال اس مسئلہ کا فیصلہ ہو یا نہ ہو۔ اتنا تو ظاہر ہے کہ شاعری سے بھینس کو کوئی تعلق نہیں۔

غالب مرحوم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بھینسوں کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ لیکن اس شہرت کی بنیاد ان یا ان کے کسی دوست کے اس شعر پر ہے ؎

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

اور صرف ایک شعر کی بنا پر غالب کو سر شہاب الدین اور حاجی لق لق کی صف میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا +

# مرزا باقر کے خطوط

مرزا باقر لکھنؤ کے ایک خاندانی بزرگ تھے جو مدتوں ہندوستان کی سیاحت کرتے رہے۔ مرزا کے آباؤ اجداد ہمدان سے بعہد عالمگیری ہندوستان آئے۔ اور مختلف خدمات پر مامور رہے جب نواب برہان الملک اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ تو میرزا کے خاندان کے لوگوں نے اودھ کے معرکوں میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ ان کے پردادا میر اشرف علی آصف الدولہ کے عہد حکومت میں فیض آباد سے لکھنؤ گئے اور وہیں اقامت گزیں ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں اُن کا خاندان بالکل تباہ ہو گیا۔ میرزا باقر کے والد کے پاس تھوڑی سی جائداد تھی۔ اسی پر گزران کرتے رہے۔ لیکن میرزا عجب وارفتہ مزاج انسان تھے۔ کبھی ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھتے تھے۔ سیر و سیاحت میں عمر گذار دی۔ انہوں نے اس سیاحت کے زمانہ میں اپنے ایک بچپن کے رفیق کو جو خط لکھے ہیں۔ اُن میں سے بعض

ہمارے ہاتھ آ گئے ہیں۔

---

برادر عزیز از جان سلمہ المنان۔ کوئی ہفتہ بھر ہوا میں تمہیں خط لکھ چکا ہوں۔ خورشید مرزا کے خط میں اپنا مستقل پتہ بھی لکھ دیا تھا۔ لیکن حیف کہ تمہیں دو پیسہ کا پوسٹ کارڈ لکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں تم کن بکھیڑوں میں پڑے ہو۔ کہ یارانِ جانی کو بھی بھلا بیٹھے۔ کہیں وہ پرانا مرض تو نہیں عود کر آیا۔ بھائی ان قصّوں کو چھوڑو۔ اور عاقبت کی فکر کرو۔ ہم تم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ نہ مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ بھلا یہ رندی و ہوسناکی کا کونسا موسم ہے سُنا نہیں؎

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون آ

ابھی تک لاہور کو اچھی طرح دیکھنے نہیں پایا لیکن ایک چیز ایسی دیکھی کہ اگر تم دیکھ پاتے تو خدا جانے کیا کر ڈالتے؟ یعنی میں نے لاہور کا مشاعرہ دیکھا اور ابھی تک زندہ ہوں۔

میں جس مکان میں رہتا ہوں اس میں بہت سے اور لوگ بھی رہتے ہیں میں حتی المقدور لوگوں سے ربط ضبط نہیں بڑھایا کرتا۔ اسلئے آجتک یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی کہ اس مکان میں کون لوگ آباد ہیں لیکن ایک صاحب

سے کسی قدر راہ و رسم ہوگئی ہے وہ رہنے والے تو پنجاب کے ہیں لیکن مدّت تک دلّی لکھنؤ اور عظیم آباد میں اُن کا قیام رہا ہے۔ اگرچہ ان کی زبان کا لوچ تو نہیں نکلا۔ لیکن یہاں کے لوگوں کے مقابلہ میں غنیمت ہیں۔ لمبے تڑنگے آدمی ہیں۔ سانولی رنگت ہے۔ جلد جلد باتیں کرتے ہیں۔ جتنی تیزی سے بولتے ہیں اتنی تیزی سے چلتے بھی ہیں۔ شاعری کے علاوہ مصوّری کا بھی شوق ہے عبدالرحمٰن نام ہے۔ آرزو تخلص کرتے ہیں۔ پرسوں بھاگے بھاگے آئے اور کسی تمہید کے بغیر کہا "مشاعرہ میں چلئے گا"

میں اناؤ کے مشاعرہ کے بعد کسی مشاعرہ میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اب جو انہوں نے مشاعرہ کا نام لیا تو طبیعت شگفتہ ہوگئی۔ پوچھا مشاعرہ کہاں ہے کہنے لگے لاہور میں ہے۔ میں نے کہا چلو نگا کیوں نہیں۔ مگر یہ تو کہئے کہ مشاعرہ میں کہاں کہاں کے شاعر ہونگے۔ لکھنؤ سے کون کون آیا ہے؟ دلّی کے کسی شاعر کو بھی بُلوایا ہے یا نہیں۔ وہ بولے لکھنؤ سے میرزا یاس آئے ہیں اور مراد آباد کے جگر صاحب تشریف لائے ہیں۔ پھر یہاں کے شاعر بھی ہیں میں نے کہا یاس کون؟ ... لکھنؤ کے شاعروں میں سے یاس کسی کا تخلص نہیں اور مراد آباد برتنوں کیلئے مشہور ہے۔ وہاں کے لوگوں کو شاعری سے

کیا سروکار؟ خیر چل کے دیکھتے ہیں کہ میرزا یاس کون ہیں اور مراد آباد میں شاعر کیوں کر پیدا ہونے لگے؟

میں نے پوچھا طرح کیا ہے؟ کہنے لگے یہاں طرح کا رواج نہیں۔ ہر شخص کو آزادی ہے کہ جو شعر چاہے پڑھ دے۔ ایں گل دیگر شگفت طرح نہیں تو مشاعرہ کاہے کو ہوا کبوتروں کی پالی ٹھہری۔ اس سے بھی یقین ہو گیا۔ کہ میرزا یاس مقرر لکھنؤ کے رہنے والے نہیں۔ لکھنؤ والے ہوتے تو اس قسم کے بے سروپا مشاعرہ میں آنا قبول نہ کرتے۔

چونکہ مشاعرہ نماز مغرب کے بعد شروع ہونے کو تھا۔ اس لئے میں اور میاں آرزو شام سے پہلے ہی گھر سے چل پڑے راستہ میں نماز پڑھی اور ٹہلتے ٹہلتے مشاعرہ میں جا پہنچے۔ دروازہ پہ ایک دبلے پتلے نوجوان نے جو صورت شکل سے کرسٹان معلوم ہوتا تھا۔ روکا اور کہا کہ ٹکٹ دکھائیے۔ ٹکٹ کا نام سنکر میں چکرایا کہ کہیں ہم سرکس میں تو نہیں آ گئے۔ چنانچہ میں نے آرزو سے کہا بھی۔ کہ بھائی تم مجھے کہاں لے آئے۔ میں سرکس نہیں دیکھوں گا۔ مجھے ہمیشہ ان خرافات سے نفرت رہی ہے۔ وہ کہنے لگے کہ میرزا صاحب! یہ سرکس نہیں مشاعرہ ہے ادھر کے مشاعروں میں یہی رواج ہے۔ ٹکٹ کے دام پوچھے تو اور وحشت ہوئی

پانچ نہیں دس نہیں۔ دو نہیں چار نہیں۔ صرف چار آنے متاعِ سخن کی اس ارزانی سے طبیعت ایسی منغّض ہوئی کہ میں نے بھاگنے کا ارادہ کر لیا مگر میاں آرزو نے روکا کہ اب آپ آ گئے ہیں تو شاعری کی فضیحت بھی دیکھتے جائیے۔ دیکھو بھیّا تمہیں یاد ہے کہ کلکتہ والی ملکہ جان سے جب لوگوں نے کہا کہ تھیٹر میں گانا سناؤ تو پانچ دس روپے کا ٹکٹ مقرر کیا جائیگا۔ آدھی آمدنی تم لے لینا۔ تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہ اس عمر میں یہ رسوائی کیوں ہو۔ لیکن یہاں شاعروں پر ٹکٹ لگتا ہے اور وہ بھی صرف چونّی کا۔ تمہیں کہو کہ شاعری کی یہ بے قدری دیکھ کر کلیجہ خون نہ ہو جائے تو اور کیا ہو؟

غرض ہم ٹکٹ خرید کے مشاعرے میں پہنچے۔ ایک وسیع کمرہ میں مشاعرہ تھا۔ کرسیوں کی نشستیں، کچھ بنچیں بھی تھیں۔ سامنے بالکل تھیٹر کی طرح ایک چبوترہ سا تھا۔ اس پر بھی کرسیاں بچھی تھیں۔ کچھ لوگ آ چکے تھے۔ کچھ آ رہے تھے۔ میری وضع قطع سے لوگوں کو میرے شاعر ہونے کا شُبہ ہوا۔ اُن میں سے کچھ آگے بڑھے کہ آئیے میں تو حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ لیکن آرزو نے بڑھ کر کہا کہ ہم شاعر نہیں۔ پھر بھی ان لوگوں نے کچھ میری ضعیفی اور کچھ قدیمانہ وضع کا لحاظ کر کے ہمیں اگلی نشستوں پر جگہ دی۔ مگر ہر طرف

غل غپاڑہ مچا ہوا تھا۔ لوگ زور زور سے زمین پر پاؤں مارتے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے اور مشاعرہ والوں پر آوازے کستے تھے۔ اکثر لوگوں کی نظریں مجھ پر لگی تھیں۔ کچھ مسکراتے تھے۔ کچھ چپکے چپکے اشارے کرتے بعض مجھے دیکھ دیکھ کر اپنی زبان میں کچھ کہتے تھے۔ میں نے آرزو سے کہا یہ کیا حرکت ہے؟ وہ کہنے لگا۔ میرزا صاحب! چپکے بیٹھے رہئے۔ یہاں کے مشاعرے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں مشاعرہ شروع ہوا۔ ایک صاحب جو کسی کالج کے پروفیسر اور خود بھی شاعر ہیں صدر مقرر ہوئے اور وسط میں جو کرسی بچھی تھی اس پر جا بیٹھے۔ پھر ایک صاحب جنہوں نے اس محفل کا انتظام کیا تھا۔ آئے اور دو تین جملے کہے۔ جن میں ایک جملہ مجھے عمر بھر نہ بھولے گا۔ یعنی انہوں نے فرمایا کہ صاحبان یہ مشاعرہ بے طرح ہے اور سچ کہا مشاعرہ کے بے طرح ہونے میں کس کو یارائے کلام ہے۔ در اصل اس جلسہ میں مشاعروں کی سی کوئی بات نہیں تھی۔ ایک عام مجمع تھا۔ جس میں ہر قسم کے لوگ شریک تھے صدر کے نام پکارنے پر ایک ایک شاعر آتا اور کھڑے کھڑے شعر پڑھ کر چلا جاتا۔ کچھ تھیٹر کی نقل تھی۔ کچھ جلسوں کا انداز۔ نہ مشاعرہ کے تکلفات۔ نہ ادب آداب۔ نہ شمع گردش کرتی نہ مصرع اٹھایا جاتا۔ نہ سلیقہ سے داد

دی جاتی تھی۔ سب سے پہلے ایک نوجوان جس کی مسیں بھی ابھی نہیں بھیگی تھیں آیا۔ بچارا کچھ سہما ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے غزل کا مطلع پڑھا۔ تو میں نے اس کا جی بڑھانے کو کہدیا۔ سبحان اللہ کیا خوب کہا ہے؛ بس میرا اتنا کہہ دینا قیامت ہوگیا۔ اب جو ہے میری طرف دیکھ دیکھ کے ہنس رہا ہے۔ یہ کیفیت خدا جانے کب تک رہتی۔ بڑی خیر گذری کہ ادھر صدّ نے خاموش خاموش پکارا ادھر نوجوان شاعر نے حسن مطلع پڑھا اور لوگوں کی توجہ اس طرف منعطف ہوگئی اگرچہ غزل کے شعر پھیکے تھے تاہم کچھ ایسے بُرے بھی نہیں تھے۔ لیکن اس نے ابھی دو تین شعر ہی پڑھے تھے۔ کہ ہر طرف ایک شور مچ گیا۔ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ماجرا ہے؛ میں نے آرزو سے پوچھا یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؛ اس نے جھک کر میرے کان میں کہا۔ کہ اپنے دام وصول کر رہے ہیں۔

غرض یہ نوجوان شاعر اپنی غزل ختم کئے بغیر چلا گیا۔ ایک اور صاحب آئے اور ایک نظم سُنانی شروع کردی نظم کا عنوان پہاڑ یا سڑک، بند یا میںڈک خدا جانے کیا تھا۔ بہر حال کچھ پہاڑوں کا ذکر۔ کچھ سڑکوں کی تعریف۔ کچھ جھینگروں کا تذکرہ۔ کچھ بندروں اور میںڈکوں کا مذکور۔ یہ نظم کسی قدر توجہ سے سُنی گئی۔

کیونکہ ان اطراف میں اس قسم کی خرافات بہت مقبول ہے۔ ان کے بعد ایک اور صاحب تشریف لائے جنہوں نے داڑھی مونچھ منڈا فرنگیوں کی سی وضع بنا رکھی تھی اور ایک بے سروپا غزل پڑھی۔ میں تو اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہ سکا لیکن اہل مجلس میں بہت سے لوگ سر دُھن رہے تھے۔ اور تو اور کبھی کبھی میاں آرزو کا بھی سر ہل جاتا تھا۔ میں نے آرزو سے پوچھا کہ بھائی یہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ کہنے لگے میرزا صاحب یہ فلسفی شاعر ہیں اور اشعار میں فلسفے کے بڑے بڑے نکتے بیان کر رہے ہیں۔ ان کے اشعار پر بھی بڑا ہنگامہ ہُوا پچھلی نشستوں پر جو لوگ بیٹھے تھے وہ دو تین منٹ تو غور سے ان کا کلام سنتے رہے۔ پھر اُن میں سے کسی نے پکار کے کہا کہ آپ گا کے سنائیے؟ اب ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں "ذرا گا کے ذرا گا کے" شاعر نے مجبور ہو کے گانا چاہا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بچارے کو عمر بھر میں پہلی مرتبہ گانے کا اتفاق ہوا تھا۔ پہلے تو کوشش کے باوجود آواز ہی نہ نکلی اور پھر جو اس نے گانا یا یوں کہو کہ ڈکرانا شروع کیا تو مارے ہنسی کے سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے آخر وہ غزل ختم کئے بغیر رخصت ہو گیا۔ دو تین شاعر اور آئے ان میں ایک خوش گلو شخص تھا۔ آتے ہی دو تین تانیں ایسی ماریں کہ سب بیقرار ہو گئے اور پھر جو جھنجھوٹی کی دُھن میں

غزل پڑھی تو ہر طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کا شور اُٹھا۔ لوگوں نے اس سے کئی غزلیں سُنیں اور وہ بھی جی توڑ توڑ کے گایا۔ اس کے بعد کسی دوسرے کا رنگ جمنا مشکل تھا۔ جو آیا لوگوں نے قہقہوں پر دھر لیا۔

ان سب کے اخیر میں ایک صاحب آئے۔ بھرا ہوا چہرہ۔ سانولی رنگت۔ پچاس پچپن سال کی عمر۔ داڑھی منڈی ہوئی۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ آرزو نے جُھک کے میرے کان میں کہا۔ یہ دہلی کے رہنے والے ہیں اور آرمان تخلص کرتے ہیں۔ انہوں نے غزل شروع کی "بیمار آنکھیں۔ عیّار آنکھیں" لیکن ابھی مطلع ہی پڑھا تھا کہ ایک طرف سے آواز آئی "مونچھیں" اس پر شور مچ گیا۔ اب یہ کیفیت تھی کہ ارمان صاحب "آنکھیں" کہتے ہیں اور لوگ ملکر "مونچھیں" پکارتے ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی غزل پڑھ کے ہی دم لیا۔

اب میر مشاعرہ نے کہا کہ جگر صاحب تشریف لائیں۔ لیکن جگر صاحب مشاعرہ میں آئے ہی نہیں تھے۔ آخر میاں یاس کو بلایا گیا مجھے آرزو نے کہہ رکھا تھا کہ یاس صاحب لکھنؤ کے ہیں اسلئے انہیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ دُبلے پتلے سے آدمی ہیں۔ وضع کچھ نئی کچھ پرانی۔ وہ گنگناتے ہوئے آئے اور ایرانیوں کے لہجہ میں غزل پڑھی۔ غزل کا مطلع یہ تھا ؎

یکساں کبھی کسی کی نہ گذری زمانے میں  یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

انہوں نے بھی کئی غزلیں پڑھیں۔ہاں مشاعرہ کے بعد یہ راز کھلا کہ میاں یاس لکھنوی نہیں عظیم آبادی ہیں۔البتہ ان کا بیاہ لکھنؤ میں ہوا ہے اور اس تعلق سے لکھنوی کہلاتے ہیں۔تم مجھے تحقیق کر کے لکھو کہ ان کی شادی کس خاندان میں ہوئی ہے؟ اور لکھنؤ میں کتنی دیر رہے ہیں؟

یاس صاحب کلام سنا چکے تو میر مشاعرہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ حسن اتفاق سے حضرت ثاقب لکھنوی اس مشاعرہ میں موجود ہیں۔ان سے التجا ہے کہ وہ ازراہ کرم تشریف لا کے اپنا کلام سنائیں میں نے ادھر اُدھر دیکھا کہ ثاقب کہاں ہیں لیکن یہ دیکھ کے حیرت ہوئی کہ سب کی نظریں مجھ پر لگی ہیں۔کچھ نوجوان میری طرف بڑھے اور کہنے لگے کہ حضرت سب کو آپ کا کلام سننے کا شوق ہے۔ہر چند کہا۔میں نے عمر بھر کبھی شعر نہیں کہا۔لیکن وہ نہ مانے کہنے لگے آپ کا کلام ہم نے اکثر رسالوں میں پڑھا ہے۔میں نے کہا آپ کو دھوکا ہوا ہے۔میں ثاقب نہیں۔میرا نام تو باقر ہے۔میں ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ آس پاس سے "ثاقب صاحب ثاقب صاحب" کی آوازیں آنے لگیں اور لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔اس وقت میں عجب ضغطہ میں تھا کہ ان

لوگوں کو کیونکر سمجھاؤں اتنے میں آرزو نے میرا بازو پکڑا۔ اور ان لوگوں کو ہٹا کر کھینچتا ہوا لے چلا۔ اس وقت عجب عالم تھا۔ کچھ لوگ پکار رہے تھے "ثاقب کو لاؤ۔ ثاقب کو لاؤ"۔ جگر کہاں ہے؟ کچھ زور زور سے کہہ رہے تھے۔ ہمارے دام واپس دے دو۔

میں اور آرزو بھاگے بھاگے سڑک پر پہنچے۔ اتفاق سے ایک تانگہ مل گیا۔ میں اس میں بیٹھ کر اپنی قیامگاہ پر آیا اور مشاعرہ کی بلا سے مخلصی پانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ بہر حال آئندہ یہاں کے کسی مشاعرہ میں نہیں جاؤں گا۔

# سُراغرسانی کا ایک افسانہ

پولیس نے تفتیش سے دو باتیں معلوم کیں۔ ایک تو یہ کہ مرنے والے کی موت کسی اتفاقی حادثہ سے نہیں ہوئی۔ بلکہ اُسے قتل کیا گیا ہے دوسرے یہ کہ قاتل کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

قتل کا سراغ لگانے کے لئے سب سے بڑے سراغرساں کو طلب کیا گیا۔ اس نے لاش پر ایک نظر ڈالی اور جیب سے خوردبین نکال لی۔ اُس نے ایک بال جو مقتول کے کوٹ پر پڑا تھا اٹھایا اور بولا۔ لیجئے معمّہ حل ہو گیا۔

وہ یہ بال سب لوگوں کو دکھا کے کہنے لگا "بس ہمیں اب ایک ایسے شخص کا سراغ لگانا ہے۔ جس کے سر کا ایک بال کہیں

گم ہوگیا ہے۔ وہ ہاتھ آیا۔ تو سمجھئے کہ قاتل مل گیا۔

سراغرسان نے قاتل کی تلاش شروع کردی وہ برابر چار دن اور چار راتیں نیویارک کے گلی کوچوں میں پھرتا رہا۔ وہ ہر شخص کے چہرے کو غور سے دیکھتا تھا۔ اُسے ایک شخص کی تلاش تھی۔ جس کا ایک بال گم ہوگیا تھا۔

پانچویں دن اس نے ایک شخص کا پیچھا کیا۔ جو سیاح کا بھیس بدلے ہوئے تھا۔ وہ جہازی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اور اس کے کان ٹوپی میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ "گلوری ٹانیا" جہاز پر سوار ہونے کو تھا۔ سراغرساں بھی اس کے پیچھے پیچھے جہاز پر جا پہنچا اور گرج کے بولا "اسے گرفتار کرلو"۔

پھر وہ تن کے کھڑا ہوگیا۔ اور جیب سے وہ بال نکال کے کہنے لگا "یہ اس شخص کا بال ہے۔ اور اس سے اس کا جرم ثابت ہوجاتا ہے"۔

جہاز کے کپتان نے حکم دیا "اس کی ٹوپی اُتار دو"۔

ملاحوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن ملزم گنجا تھا۔ اس

کے سر پر ایک بال بھی نہیں تھا ۔
سراغرسان اس کے گنجے سر کو دیکھ کے کہنے لگا "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص نے صرف ایک آدمی کو قتل نہیں کیا بلکہ کم از کم دس لاکھ انسانوں کا خون اس کی گردن پر ہے ۔

# کسان کا خواب

گذشتہ موسم سرما کی ایک رات کو میں نے ایک خواب دیکھا اور اپنے علاقہ کے پادری ڈان اباشیو کو جا سنایا۔ وہ سُن کے کہنے لگے یہ خواب کسی کو مت بتائیو۔ تمہیں یاد ہوگا۔ جب حکومت سے پوپ کی صلح ہوگئی۔ تو ڈان اباشیو نے قربان گاہ کے نیچے پر کھڑے ہو کر ایک تقریر کی تھی۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ کسانوں کے بھلے دن آنیوالے ہیں۔ پوپ نے مسیح سے اجازت لے لی ہے کہ کسان کی ساری ضرورتیں ایک ایک کر کے پوری کر دی جائیں۔ اسی رات کو میں نے خواب میں پوپ کو یسوع سے باتیں کرتے دیکھا۔

یسوع نے کہا "مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس صلح کی یادگار میں فوسینو کے علاقہ کی ساری زمین بچارے کسانوں میں جو اسے کاشت

کرتے ہیں تقسیم کردی جائے۔"

پوپ نے جواب دیا" میرے آقا! اس علاقہ کا جاگیردار شہزادہ نورلیونیا یہ بات کیسے مانے گا ——— یہ بات یاد رہے کہ شہزادہ نورلیونیا پطرس حواری کے مقدس فنڈ میں ہر سال ایک بہت بڑی رقم چندہ کے طور پر دیتا ہے۔"

یسوع نے کہا۔" اچھا تو پھر اس صلح کی یادگار میں کسانوں کو لگان معاف کردینا چاہیئے۔"

پوپ کہنے لگا" آقا! یہ بات حکومت نہیں مانے گی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ حکومت ہر سال جو دو ارب لیرہ جناب پطرس کے فنڈ میں دیتی ہے وہ کسانوں کے لگان سے ہی فراہم ہوتا ہے۔"

یسوع نے فرمایا۔" تو کسانوں کے دل کی مراد یوں پوری کی جائے کہ اب کے چھوٹے چھوٹے کسانوں اور زمینداروں کی اراضی میں خوب فصل ہو تاکہ انہیں کسی بات کی محتاجی نہ رہے۔"

پوپ نے جواب دیا۔" خداوندا! اگر چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی اراضی میں فصل خوب ہوئی تو زرعی پیداوار کی قیمتیں بہت گر جائیں

گی۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے تمام اسقف اور کارڈینل بڑے بڑے زمیندار ہیں۔"

یسوع کو اس خیال سے بہت دُکھ ہوا کہ وہ کسانوں کے معاملہ میں بالکل بے بس ہے اور کسی دوسرے کا نقصان کئے بغیر انہیں نفع نہیں پہنچا سکتا۔

یہ دیکھ کے پوپ نے جسے کسانوں سے سچی محبت ہے کہا۔ "خداوند! آئیے ہم خود چل کے کسانوں کی حالت دیکھیں کیا عجب ہے کہ ہم حکومت۔ شہزادہ تورلونیا اور اسقفوں کو ناراض کئے بغیر کسانوں کو فائدہ پہنچانے کا کوئی طریقہ تلاش کر سکیں۔"

چنانچہ پوپ اور یسوع دونوں پرواز کر کے فوسینو پہنچے اور مارسیکا کے علاقہ کے تمام دیہات کا معائنہ کیا۔ یسوع آگے آگے تھا۔ اور اس کے کندھے پر ایک بڑا تھیلا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے پوپ تھا۔ اور اُسے اس بات کی اجازت تھی کہ اُسے جو چیز کسانوں کے لئے مناسب معلوم ہو۔ اس تھیلے سے نکال لے۔

ان دونوں نے ہر جگہ ایک ہی کیفیت دیکھی جا بجا کسان ایک

دوسرے کو گالیاں دیتے اور آپس میں جھگڑتے اور زمانہ کی شکایت کرتے نظر آئے وہ روز بروز زیادہ مفلس ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کھانے پینے اور پہننے کا سامان مہیا کرنے کے لئے کس طرف رُخ کریں۔ یہ کیفیت دیکھ کر پوپ کو سخت قلق ہوا۔ یہ دیکھ کر اس نے تھیلے سے بیشمار جوئیں نکالیں اور انہیں یہ کہہ کر مارسیکا پر پھینک دیا:۔

"میرے بچّو! یہ جوئیں لے لو۔ اور اپنے جسموں کو کھجلاتے رہو۔ تاکہ فرصت کے اوقات میں تمہارا دھیان گناہ کی طرف نہ جانے پائے۔"

# کُتّا

میں اپنا نام نہیں جانتا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میرا کوئی نام رکھا بھی گیا تھا۔ یا نہیں۔ میری عمر کتنی ہے؟ میں یہ بھی نہیں جانتا۔ کیونکہ میں اس دنیا میں ایک اتفاقی حادثہ کی طرح وارد ہوا۔ مجھے ایک جگہ سے اٹھایا گیا۔ اور بے خیالی کے عالم میں دوسری جگہ پھینک دیا گیا۔ جس طرح کوئی راہگیر پتھر کو اٹھا کے کسی مقصد کے بغیر پھینک دیتا ہے۔ مجھے اپنے ماں باپ کا بھی حال معلوم نہیں میں اس سنسار میں ایک بھولی بسری پسماندہ چیز ہوں۔ اپنے ایسے کروڑوں کی طرح جن میں زندگی بسر کرنے کے لئے تقدیر نے مجھے پھینک دیا ہے۔ میری رنگت بھوری ہے۔ آنکھیں اور بال سیاہ ناک چپٹی۔ قد چھوٹا۔

میں نے بھی دوسروں کی طرح بچپن کا زمانہ دیکھا ہے لیکن

میرا بچپن کئی باتوں میں ان کے بچپن سے الگ تھلگ تھا۔ کسی نے مجھ سے محبت اور شفقت کا سلوک نہیں کیا۔ کسی نے میرے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو حرارت نہیں پہنچائی۔ مجھے تسلی نہیں دی۔ اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے کے متعلق مجھے بھوک پیاس سردی اور تلخ کامی کے سوا کچھ یاد نہیں۔ مجھے وقت کا کوئی صحیح اندازہ نہیں۔ ہاں البتہ اتنا یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک لانبے قد کا دُبلا پتلا بڈھا جس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ چلتے چلتے میرے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ "تمہاری لکھنے پڑھنے کی عمر ہے۔ تعلیم ہر شخص کیلئے ضروری ہے"۔ اس نے یہ باتیں آہستہ آہستہ کہیں۔ اس کی آواز میں محبت کا لوچ اور گداز تھا۔ اور اس کا چہرہ بہت سنجیدہ معلوم ہوتا تھا۔ مجھ پر اس کی باتوں کا ایسا اثر ہوا۔ کہ میں لمحہ بھر کے لئے اپنی تکلیفوں کو بھول گیا۔ اور تعلیم حاصل کرنے کے ارادے سے چل پڑا۔

جگہ جگہ عمارتیں کھڑی تھیں۔ ان میں بعض تو محلوں جیسی تھیں بعض کچھ ایسی اچھی نہیں تھیں۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ ان عمارتوں کا نام اسکول ہے۔ اور یہاں تعلیم دی جاتی ہے۔ میرے کانوں میں

بڈھے کے الفاظ ابھی تک گونج رہے تھے چنانچہ میں ایک سکول میں گھس گیا۔

"نکل جاؤ۔ یہ جگہ تم ایسوں کے لئے نہیں"

میں نے تمام چھوٹی بڑی عمارتوں کو دیکھ ڈالا۔ ہر جگہ مجھ سے یہی کہا گیا۔

یہ الفاظ تازیانہ سے زیادہ سخت اور خوفناک تھے۔ خوف اور اذیت کے مارے میں نے سر جھکا لیا۔ میرے کانوں میں اسکول کے طلبا کی ہنسی گونج رہی تھی۔ اور میں سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ میں سچ مچ انسان ہوں۔ میں اس بات پر جتنا غور کرتا تھا۔ میرے شبہات قوی ہوتے جاتے تھے۔ میں نے اس سوال کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہا لیکن ایک طنز آمیز صدا میرے کانوں میں کہہ رہی تھی "کیا تمہارا انسان ہونا ممکن ہے"۔ میں اکیلا تھا۔ افسردہ۔ مضمحل اور مجبور۔ دنیا مجھ کو بھلا چکی تھی۔

آخر کار میں نے ایک ٹوٹے پھوٹے مندر میں پناہ لی جہاں میں رات کو پڑ رہا کرتا تھا۔ میں آج اس مندر کے دیوتا سے یہ بھید پوچھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ دیوتا سب کچھ جانتا ہے۔ مجھے اس سے اس سوال کا جواب مل جائیگا۔

دیوتا کے سامنے جو پردہ لٹکا رہتا تھا۔ وہ پھاڑ کے پھینک دیا گیا تھا۔ اس کی ننگی مورت جس سے فرسودگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ تنہا بیٹھی تھی۔ اس پر گرد پڑی تھی اور اس کا ایک بازو غائب تھا۔ میں اس کے سامنے دوزانو ہو کر دُعا مانگنے لگا۔

"اے قدرت والے دیوتا۔ اس پہیلی کو بوجھنے میں میری مدد کر۔ کیا میں سچ مچ انسان ہوں۔"

دیوتا خاموش تھا۔ اس کے گرد آلود مُنہ کو ذرا بھی حرکت نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں جواب کی چمک تک نہیں تھی۔

اب میں نے عقلی دلائل کا سہارا لیا۔ "مجھ ایسی شے کا دوسرے انسانوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ وہ مجھ سے بالکل مختلف ہیں حرارت۔ آرام۔ انسانی احساسات یہ سب چیزیں انسانوں کے لئے

مخصوص ہیں۔ اور ان میں سے کوئی چیز مجھے نہیں دی گئی ہیں بچی کھچی چیزوں پر جنہیں حقیقی انسان پھینک دیتے ہیں۔ گزارہ کرتا ہوں اگر میرا شمار انسانوں میں کر لیا جائے تو یہ انسانیت کی توہین ہوگی واقعی میں انسانوں کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ میں انسان نہ سہی تاہم مجھے دنیا میں کسی نہ کسی مقصد کے لئے بھیجا گیا ہوگا۔ میرے وجود کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور ہے۔ جب ہر چیز خریدی اور فروخت کی جا سکتی ہے۔ تو مجھے کیوں نہیں فروخت کیا جا سکتا۔ میں نے اپنی پیٹھ پر ایک کاغذ لگا لیا۔ جس پر قیمت لکھی ہوئی تھی۔ اپنے آپ کو بیچنے کے لئے منڈی میں جا پہنچا۔ پہلے کچھ دیر ایک جگہ کھڑا رہا۔ پھر دوسری جگہ جا کھڑا ہوا۔ میں نے لوگوں کو اپنا سارا جسم دکھایا۔ اور چلا چلا کے کہنے لگا۔ مجھے خرید لو۔ اگر کوئی شخص مجھے خرید لے۔ تو میں اس کے پس خوردہ پر قناعت کروں گا۔ اور ساری عمر کتے کی طرح اس کے ساتھ رہوں گا۔

میں منڈی میں دن بھر رہا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ لیکن

کوئی شخص مجھے خریدنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ ہاں چھوٹے بچے ضرور مجھے چھیڑتے اور دق کرتے رہے۔

میں جب منڈی سے لوٹا۔ تو مجھ پہ بھوک اور تکان کا غلبہ تھا۔ راستہ میں مجھے خشک روٹی کا ایک ٹکڑا جو مٹی میں لت پت تھا۔ نظر آیا۔ اور میں نے اسے اٹھا کے کھانا شروع کر دیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا۔ کہ میں ایسی چیزیں کھا سکتا ہوں۔ تو ضرور ہے کہ میرا معدہ کتے کے معدہ کا سا ہو۔

ویران مندر میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ جب میں لیٹ گیا۔ تو مجھے دیر تک یہ خیال ستاتا رہا۔ کہ اس دنیا میں میرا کوئی مصرف نہیں۔

میں جو کچھ بھی ہوں۔ اتنا ظاہر ہے۔ کہ انسانوں کے نزدیک میری کوئی قیمت نہیں۔ میں زار و قطار رونے لگا۔ لیکن قدرت کا یہ بیش قیمت عطیہ یعنی آنسو بھی مجھے کوئی تسکین نہ دے سکے۔

پھر بھی میں برابر روتا رہا۔ کیونکہ اس کے سوا میرے لئے اور کوئی کام نہیں تھا۔ میں اپنے آپ کو آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں دے

سکتا تھا۔ اور میں صرف مندر میں ہی نہیں روتا رہا۔ بلکہ جب میں مندر سے باہر نکل کر ایک دولت مند آدمی کے دروازہ پر جا کھڑا ہوا۔ تو میری آنکھوں سے برابر آنسو بہہ رہے تھے۔

میں اس عالی شان مکان کے دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑا تھا۔ میں بھوکا تھا۔ میرا سارا جسم مارے سردی کے ٹھٹھرا ہوا تھا۔ میں اونچی آواز سے رو رہا تھا۔ تاکہ پیٹ کی تکلیف کو بھول جاؤں۔ ایک نوجوان جو غیر ملکی لباس پہنے ہوئے تھا۔ میرے پاس سے گذر کر مکان کے اندر چلا گیا۔ لیکن اس نے میری طرف توجہ نہیں کی۔ تھوڑی دیر میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی گذرا۔ لیکن اس نے بھی مجھے نہیں دیکھا۔ سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے۔ لیکن کسی نے میری طرف آنکھ اٹھا کے دیکھا تک نہیں۔

سب سے آخر میں ایک لمبا تڑنگا آدمی مکان سے نکلا۔ اس نے مجھے دیکھ پایا۔ وہ گالیاں دیتا اور چلاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اور مجھے ٹھوکر مار کر کہنے لگا۔

"چلے جاؤ۔ یہ جگہ رونے کے لئے نہیں۔

اب میرے آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ میں گھسٹتا اور رینگتا ہوا مندر میں پہونچا۔ اور دیوتا کی ٹوٹی پھوٹی مورت کے سامنے دوزانو ہو گیا۔ اس مورت کے سوا دنیا میں میرا کوئی دوست نہیں تھا۔

"قدرت والے دیوتا۔ میں انسان تو نہیں ہوں۔ لیکن تقدیر مجھے یہاں لے آئی ہے۔ اور مجھے بہر حال زندہ رہنا ہے۔ میں یتیم ہوں۔ میں اپنے ماں باپ کو نہیں جانتا۔ تاہم مجھے ایک غمخوار کی ضرورت ہے۔ اے فیاض اور عادل دیوتا مجھے اپنا بیٹا بنالے۔ میں نسل انسانی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ انسانی محبت میری قسمت میں نہیں ہے"

دیوتا کے لبوں کو حرکت نہیں ہوئی۔ اس نے مجھے رد نہیں کیا اب ایک بازو والا یہ بت۔ یہ فیاض اور عادل دیوتا میرا باپ تھا۔

## (۲)

میں ہر روز بھیک مانگنے جاتا تھا۔ اور جو کچھ پاتا تھا۔ اس سے اپنا پیٹ بھر لیتا تھا۔ مگر جب میں گھر کو لوٹتا تھا۔ تو میرا دل مسرت و اطمینان کے لئے نئے احساس سے معمور ہوتا تھا۔ کیونکہ اب میں پہلے کی طرح بے بس نہیں تھا۔ مندر کے دیوتا نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔

یہ سچ ہے۔ کہ اس نے کبھی زبان نہیں کھولی۔ اس نے مجھے کبھی تسلی نہیں دی۔ مگر وہ مجھے چھوڑ کر بھی تو نہیں چلا گیا۔ میں جب آتا تھا۔ اسے وہیں پاتا تھا۔

وقت تیزی سے گزرتا چلا گیا۔ اب میری عمر اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا۔ کہ میں انسان نہیں ہوں۔ میں ہمیشہ اپنے آپ کو یقین دلاتا رہتا تھا۔ کہ مجھے نسل انسانی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری زندگی اتنی عجیب ہے۔ تاہم مجھے اس بات کا احساس تھا۔ کہ میرے اندر انسانوں کی سی خواہشات پیدا ہو رہی ہیں۔ میرا جی تازہ غذا۔ صاف ستھرے کپڑوں۔ خوبصورت مکان اور گرم بستر کو چاہتا تھا۔ لیکن جب یہ خیال آتا تو میں اپنے آپ سے کہتا تھا۔ کہ تم ان چیزوں کا تصور کیسے کر سکتے ہو۔ یہ تو انسانوں کی خواہشات ہیں۔" تاہم وہ تمام خوبصورت چیزیں جنہیں میں روز دکانوں میں دیکھتا تھا۔ مجھے بار بار یاد آتی تھیں۔ آور ہاں عورتوں کی طرف بھی میرا دل بے اختیار کھچ جاتا تھا۔ ان کا تبسم برق ریز تھا۔ ان کی ٹانگیں نرم آور سفید۔ ریشم کی طرح ملائم۔ لیکن میرا خیال تھا۔ کہ انہیں چھوا جائے۔ تو وہ ضرور پر حرارت ہوں گی۔ کیا آپ یقین

کرسکتے ہیں۔ کہ مجھ ایسی چیز کے دل میں اس قسم کی آرزو پیدا ہو سکتی ہے میں انہیں پیار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب میں ان کے قریب جاتا تھا مجھے دفعتہً یاد آجاتا تھا۔ کہ میں ایک ایسی چیز ہوں جس کی اصلیت کسی کو بھی معلوم نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں اس آرزو کو دل سے نکال دیتا تھا۔

ایک دن میں نے دو ٹانگیں دیکھیں۔ ایسی متناسب۔ ملائم اور خوبصورت ٹانگیں میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ان کے پاس ہی ایک چھوٹا سا سفید کتا بھی تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے خیال آیا "تمام حقوق انسانوں کے لئے ہی نہیں۔ ہم کتے بھی بعض خاص خاص حقوق رکھتے ہیں"۔ اس خیال نے مجھ میں یکایک ایسی جرأت پیدا کر دی۔ کہ میں ان ٹانگوں کو لپٹ جانے کے لئے بڑھا۔ لیکن کسی شخص نے مجھے پکڑ کر زمین پر گرا دیا وہ مجھے ٹھوکریں مارتا اور ساتھ ساتھ کہتا جاتا تھا "تم پاگل ہو گیا ہے؟" سندر میں آکر میں نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ میں کتے سے زیادہ ذلیل ہوں۔ میرے باپ۔ میرے دیوتا۔ مجھے اصلی کتا بنا دے۔ اس سپید چھوٹے سے کتے کی طرح۔ تاکہ میں انسانوں کی محبت اور آسائش میں حصہ لے سکوں۔

(۳)

بھوری رنگت۔ کالے بال۔ چپٹی ناک۔ چھوٹا قد۔ بہت سے اصلی انسانوں کیطرح میرے حصّہ میں بھی یہ چیزیں آئی تھیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں۔ جن کی رنگت سفید ہے۔ بال سنہری سوتواں ناک۔ لانبا قد۔ یہ لوگ اس بیباکی سے قہقہے لگاتے۔ گاتے اور شور مچاتے گلی کوچوں میں سے گذرتے تھے۔ گویا زندگی صرف ان کے لئے ہے دوسرے لوگوں کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ وہ ان سے ہمیشہ دُور دُور رہتے تھے۔ انہیں ان کے پاس سے گزرنے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس طرح مجھے یہ نئی بات معلوم ہوئی۔ کہ انسان دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو ان دونوں سے اونچا درجہ رکھتے ہیں میں ان اونچے درجے کے انسانوں کو اکثر دیکھتا تھا۔ ان میں کچھ ایسے تھے۔ جو سفید ٹوپیاں۔ سفید قمیضیں اور سفید پتلونیں پہنتے تھے۔ وہ ہمیشہ ہنستے اور آپس میں چہل کرتے نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ لڑ بھی پڑتے تھے۔ اور جب لڑتے تھے۔ تو بھوری رنگت کے انسانوں کے سروں پر تولیں توڑی جاتی تھیں۔ کبھی وہ رکشا میں بیٹھے نظر آتے تھے۔

اور ان کی گود میں عورتیں بیٹھی ہوتی تھیں۔

سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ انہیں دیکھ کر راستہ سے ہٹ جاتے تھے۔ گویا فانی انسانوں میں ان کا درجہ سب سے اونچا تھا۔ میں کبھی ان کے پاس نہیں پھٹکا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ مجھے اپنے قریب پاکر وہ ناراض ہوجائیں گے۔ لیکن ایک شام کو میں ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا اپنے پاؤں کو جو کیچڑ میں لت پت اور خون آلود تھے۔ مل رہا تھا۔ میں بہت تھکا ماندہ تھا۔ اور مجھے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ کہ یکایک کچھ لوگ کہیں سے میرے سامنے آگئے۔ میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ یہ انہیں اعلیٰ نسل کے انسانوں میں سے تھے۔ میں اب بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے جہاں بیٹھا تھا۔ وہیں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مجھے دیکھ کر وہ چلا چلا کر کہنے لگے۔ "چلے جاؤ یہاں سے" پھر وہ مجھے ٹھوکریں مارنے لگے۔ انہوں نے کئی دفعہ مجھے کتا کہا۔

جی ہاں۔ انہوں نے مجھے کتا کہا۔ میں جب رات کو مندر میں گیا۔ تو میں نے دیوتا کا شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ یہ اونچے درجے کے لوگ مجھے کتے سے زیادہ ذلیل نہیں سمجھتے تھے۔ اس نے واقعی میرے دل میں امید کی لہر

سی پیدا کر دی۔ اگر میں کُتّا ہوں۔ تو مجھے کُتّوں کے سے حقوق کیوں نہ ملیں۔ مجھے وہ چھوٹا سا سپید کُتّا یاد آگیا۔

پھر جب میں نے سڑک میں دو حسین ٹانگیں دیکھیں۔ تو میرا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ مجھے یاد آگیا۔ کہ اب میں گوری رنگت کے لوگوں کی نظروں میں کُتّا ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنے حقوق سے فائدہ اٹھانے کا قطعی ارادہ کر لیا۔ اور آگے بڑھ کر ان ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اس وقت مجھے اس بات کے سوا اور کچھ یاد نہیں تھا۔ کہ اب میں مسلمہ طور پر کتا ہوں۔ اور مجھے ٹانگوں سے لپٹنے کا حق حاصل ہے۔ مجھے پہلے شور و غل سا سنائی دیا۔ پھر مجھ پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش ہونے لگی۔ سینکڑوں ہاتھ مجھے کھینچ رہے تھے۔ لیکن میں نہ کچھ سن سکتا تھا۔ . . . . . نہ کچھ محسوس کر سکتا تھا۔ بلکہ بدستور ان حسین ٹانگوں سے چمٹا ہوا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی۔ تو میں نے اپنے آپ کو ایک بڑے اور تاریک تہ خانے میں پڑا پایا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کہیں کوئی انسانی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ میرے جسم کا بند بند درد کر رہا تھا۔ اور میں بڑی مشکل سے سانس لے سکتا تھا۔ میرا باپ وہ فیاض اور عادل دیوتا چپ چاپ اپنے مندر میں بیٹھا ہے۔ اس پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے لیکن میں اب کبھی اس ٹوٹے ہوئے بازو والی مورت سے کوئی التجا نہیں کروں گا۔

# الکشن

سلیمان مرزا کا الکشن تمہیں یاد ہی ہوگا۔ ایک طرف مرزا تھے۔ اور بڑے بڑے نامی رئیس۔ دوسری طرف مولوی روح اللہ اور شہر بھر کے اساطی لساطی کنجڑے قصائی۔ لیکن صاحب مقابلہ ایسا کڑا تھا۔ کہ مرزا کو دانتوں پسینہ آ گیا۔ دو دوستوں کی محفل میں تو بیٹھ کر خوب چہکتے تھے۔ لیکن جہاں جلسہ گاہ میں قدم رکھا۔ حواس غائب غلہ ہو گئے۔ اُن کے مقابلہ پر روح اللہ سا چھٹا ہوا گرگا تھا۔ جس کی ساری عمر انہیں کھیلوں میں کٹ گئی تھی۔ اگرچہ پھوٹی کوڑی تک پاس نہیں تھی۔ مگر چھوٹی اُمت کے دلوں میں اُس کی کچھ ایسی عزت تھی۔ کہ جہاں اُس کا پسینہ گرتا تھا۔ لوگ خون گرانے کو تیار ہو جاتے تھے۔

مرزا سے میری پرانی صاحب سلامت تھی۔ اس لئے جب اُنہوں نے کہا کہ بھیا دوستی کی آزمائش کا یہی وقت ہے۔ تو میں مجبور ہو گیا۔ تم جانتے ہو الیکشن کیا ہوتا ہے؟ راتوں کی نیند اور دن کا آرام حرام ہو جاتا ہے کا گند

بنے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں کی صورت سے گھن آتی ہے۔ انہیں چچا بابا بنا رہے ہیں۔ ایک دفعہ میں دوپہر کو گھر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ بیگم اٹواٹی کھٹواٹی لئے پڑی ہیں۔ پوچھا خیر باشد کہنے لگیں۔ کوئی مرے یا جیئے۔ تمہیں کیا؟ میں نے کہا۔ واقعی میرا ہی قصور ہے۔ میں ادھر کئی دنوں سے ایسا مصروف ہوں۔ کہ تم سے دو باتیں بھی نہ کر سکا۔ بس اتنا کہنا تھا۔ کہ شعلہ کیطرح بھڑک اٹھیں اور کہنے لگیں۔ کچھ ننھی بچی تو نہیں۔ کہ ان باتوں کو نہ سمجھوں۔ میں تو اڑتی چڑیا کے پر گنتی ہوں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ سینے پر صبر کی سل رکھے بیٹھی ہوں سب کچھ دیکھتی ہوں۔ اور اُف تک نہیں کرتی۔ میں پوچھتی ہوں۔ کہ یہ گھر ہے۔ یا سرائے کہ جب جی چاہا آ گئے جب جی چاہا۔ چل دیئے۔ اور جب آئے۔ ایک دو موئے خدائی خوار ساتھ ہیں۔ کھانا منگوایا۔ آپ بھی کھایا۔ انہیں بھی کھلایا پھر حقے کے دو کش لگائے۔ دو دو گلوریاں ڈبیا میں رکھیں۔ دو دو کلے میں دبائیں اور چل کھڑے ہوئے۔ اور میں تو کہوں گی۔ کہ گھر سرائے سے بدتر ہے سرائے میں یہ طریقے برتو تو بٹھیارا بڑھ کر گردن ناپے کہ حضور میرا حساب چکا کے جائیے۔

ہاں تو وہ سٹنڈا جسے تم پرسوں ساتھ لائے تھے۔ کون ہے۔ کل صبح

پھر آیا تھا۔ میں نے کرمین کے ہاتھ کہلا بھیجا۔ کہ میاں گھر پہ نہیں۔ شاید دوپہر کو آئیں۔ کہنے لگا۔ کہ میں اس تپتی دھوپ میں اب کہاں جاؤں گا۔ یہیں اُن کا انتظار کر لیتا ہوں۔ ہاں ذرا بھاوج سے کہہ دینا پان لگا کے بھیج دیں۔ میں حقہ نہیں پیتا۔ البتہ سگریٹ پی لینے میں مضائقہ بھی نہیں سمجھتا۔ کچھ سگریٹ ہوں۔ تو بھجوا دیجئے۔ دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھاؤں گا۔ میرے لئے کوئی خاص تکلّف کرنے کی ضرورت نہیں۔ گھر میں جو پکا ہے۔ لے آنا۔ ہاں دسترخوان پہ میٹھے ٹکڑے ضرور ہوں۔ تھوڑی سی بالائی بھی منگوا لیجئے گا۔ میں نے کہلا بھیجا۔ کہ دیوان خانے کی چابی آپ کے بھائی کے پاس ہے۔ کھانا آج نہیں پکے گا۔ کیونکہ سب کو روزہ ہے۔ بہرحال دوپہر کو تشریف لے آئیے گا۔ اُس وقت آپ کے بھائی بھی یہیں ہوں گے۔ کھانے کا کیا ہے۔ بازار سے آجائے گا۔ یہ سُن کر وہ بڑبڑاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ مگر تھوڑی دُور جا کر پلٹے اور کہنے لگے۔ اچھا دو گلوریاں ہی بھجوا دیجئے۔ ناچار پان لگا کے بھیجے۔ اور یہ مردوا انہیں زہر مار کر کے ٹلا۔

کچھ انصاف کرو۔ تمہاری ساری آمدنی مل ملا کے سو روپلی ہوگی۔ اس پر اتنا بڑا کنبہ۔ آئے گئے کی مہمانداری کا خرچ۔ پھر تمہارے دوستوں کی فرمائش

ایک کا منہ تو کھانڈ سے بھرا جا سکتا ہے۔ لاکھ کا منہ خاک سے بھی نہیں بھرا جا سکتا۔ خیر اسے بھی جانے دو۔ یہ راتوں کو غائب رہنا تم نے کس سے سیکھا ہے۔ کبھی آدھی رات آکے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کبھی پچھلے پہر تشریف لے آئے۔ میں بھی تو سنوں۔ آخر راتوں کو کیا مصروفیت رہتی ہے؟

میں نے کہا "الکشن کی مصیبت سر پر ہے۔ وہاں سے آدھی آدھی رات تک گلو خلاصی نہیں ہوتی۔ ہر رات کو کہیں نہ کہیں جلسہ ہوتا ہے۔"

کہنے لگیں "تم نے اچھا کیا۔ کہ صاف صاف میرے منہ پر کہہ دیا۔ میرا ماتھا تو اسی دن ٹھنکا تھا۔ جب تم اور نذیر بھائی دیوان خانہ میں بیٹھے "طوائف الملوکی طوائف الملوکی" کہہ رہے تھے۔ اور میں پٹ سے لگی تمہاری باتیں سن رہی تھی۔ میں تمہاری طرح ترکی اور انگریزی پڑھی ہوئی نہ سہی طوائف الملوکی کا مطلب تو سمجھتی ہوں۔ آخر تمہارے یہی ارادے ہیں نا۔ کسی مارواڑی طوائف کو گھر میں لا بٹھاؤ۔ اور میری چھاتی پر مونگ دلو۔ پارسال اس موئی گلشن سے پینگ بڑھ رہے تھے۔ اب کے اُن کی بہن کوئی بی الکشن آگئی ہیں راتوں کو اُن کے ہاں جلسے رہتے ہیں۔ خیر تم نے اپنا دیدہ ہولی کیا ہے۔ تو راج رجو مگر بندی کو آج ہی میکے رخصت کر دو۔ ماں باپ نہ سہی۔ اللہ بھائیوں

کو زندہ رکھے۔ موئی مٹی کی نشانی مجھ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ ہانڈی چولھے کے دھندے سے تو چھوٹوں گی۔

میں نے ہر چند ..... الکشن۔ ووٹ۔ طوائف الملوکی کا مطلب سمجھایا مگر اللہ کی بندی کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ خیر اُس وقت تو میں ہار کے چلا گیا لیکن شام کو واپس آیا۔ تو دیکھتا ہوں۔ کہ گھر سنسان پڑا ہے۔ نوکر سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے؟ وہ کہنے لگا۔ کہ بی بی کریمن کو ساتھ لے کر اپنے میکے چلی گئی ہیں۔

مرزا سلیمان تو خیر کسی نہ کسی طرح الکشن میں جیت گئے۔ مگر ہمارے گھر میں اس الکشن کی وجہ سے ایسی پھوٹ پڑی۔ کہ بیگم تین مہینے میکے میں بیٹھی رہیں اور تین مہینے کے بعد منتوں خوشامدوں سے آئیں بھی تو۔ تو روز کی دانتا کل کل سے میرا ناک میں دم آگیا۔ خیر صاحب اس واقعہ سے ایسی نصیحت ہوئی کہ میں نے پھر کبھی الکشن میں حصہ نہیں لیا۔

# شاہ اُلفت حُسین

شاہ الفت حسین کو میں نے پہلی مرتبہ حکیم[1] نثار احمد کے ہاں دیکھا تھا۔ گورے چٹے آدمی تھے۔ چہرے پر جھرّیاں پڑی ہوئیں۔ سر اور داڑھی کے بال سپید ہو چکے تھے۔ ساٹھ پینسٹھ برس کا سن ہوگا۔ جوانی میں ضرور طرحدار رہوں گے۔ لیکن جن دِنوں میں نے اُنہیں دیکھا۔ بہت نحیف و ناتواں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ جسم میں لہو کی ایک بوند بھی باقی نہیں رہی۔

رسمی تعارف کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب اُن کی وحشت کسیقدر دُور ہوگئی۔ تو میں نے پُوچھا "دُلہن کا کیا حال ہے؟" وہ بولے۔ بھائی کیا پُوچھتے ہو۔ دراندازوں کا بُرا ہو۔ جنہوں نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ اِدھر میرے دوست آشنا حسد کی آگ میں جل رہے ہیں۔ کہ اُلفت حُسین

---

[1] حکیم نثار احمد صاحب کلکتہ کے نامور طبیبوں میں سے ہیں۔ خوش مزاج یار باش بزرگوار ہیں۔ قومی تحریکوں میں بھی حصّہ لیتے رہتے ہیں۔

کوہ قاف کی پری فیروز شاہ جنّی کی دختر بلند اختر کو بیاہ لایا۔ اُدھر فیروز شاہ جنّی کے بھائی بند بگڑے ہوئے ہیں۔ کہ پری اور آدم زاد کا میل کیسے ممکن ہے؟ غرض کچھ انہوں نے بہکایا۔ کچھ اُنہوں نے پھُسلایا۔ نامہ و پیام کا سلسلہ مسدود ہوا۔ نہ اب اُدھر سے کوئی آتا ہے۔ نہ میں وہاں جا سکتا ہوں۔ فیروز شاہ نے گرینڈ ہوٹل کی عمارت اپنی بیٹی کے جہیز میں دیدی تھی۔ اُس کا بھی کوئی فیصلہ نہیں ہُوا۔ بس بیٹھا اپنی قسمت کو رو رہا ہوں۔

---

دراصل میں شاہ اُلفت حسین کی داستان عشق پہلے ہی سُن چکا تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ وہ چاندنی رات میں مکان کی چھت پہ چارپائی بچھائے لیٹے ہوئے تھے۔ کہ اُدھر سے فیروز شاہ جنّی کی بیٹی ملکہ مہر نگار کا گذر ہوا۔ ان پر نظر پڑتے ہی وہ ہزار جان سے عاشق ہو گئی۔ پہلے تو ماں باپ نے سمجھایا۔ کہ بیٹی آدم زاد غیر کفو اُس سے تمہارا بیاہ کیسے کر دیں؟ لیکن جب دیکھا کہ معاملہ حد سے بڑھ چکا ہے۔ تو مجبور ہو کر شادی کی اجازت دیدی غرض شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ ملکہ لالان خونقبا۔ ناہید گلگوں پوش اور سیمائے قمر طلعت سب شریک ہوئیں۔ ایک کروڑ دینار پر نکاح پڑھا گیا۔ اور فیروز شاہ جنّی

نے گرینڈ ہوٹل اور کلکتہ کی کئی دوسری عمارتیں بیٹی کے جہیز میں دے ڈالیں۔ لیکن رات کو جب دولھا دولہن یکجا ہوئے۔ اور نوشہ میاں نے دلہن کے چہرے سے پردہ ہٹانے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو مکان کی چھت دفعتاً پھٹ گئی۔ اور جنوبی قاف کا ایک شاہزادہ جو ملکہ مہرنگار پر جان دیتا تھا۔ اسمائے سحر پڑھتا ہوا نمودار ہوا۔ اُس نے آتے ہی میاں الفت حسین کو ڈھکیل دیا۔ یہ پلنگ سے فرش پر آرہے۔ اور گرتے ہی بیہوش ہوگئے۔ کچھ دیر میں ہوش آیا۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ شہزادی تو غائب ہے۔ اور اُس کی جگہ ایک ہٹا کٹا مرد دازنانہ لباس پہنے مسکرا رہا ہے۔ بچارے شاہ صاحب کچھ کہنے نہیں پائے تھے۔ کہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اور ایک قہقہہ کی آواز آئی۔ پھر ایسا معلوم ہوا۔ کہ بہت سے آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اتنے میں کسی نے دلہا میاں کو پلنگ کے پائے سے خوب کس کر باندھ دیا۔ اس صدمہ سے وہ پھر بیہوش ہوگئے۔ صبح کو آنکھ کھلی۔ تو اپنے آپ کو فرش پر لیٹے پایا۔

---

کچھ دنوں کے بعد الفت حسین صاحب کو ایک دوست سے معلوم ہوا۔ کہ شاہزادی مہرنگار کو اُس نا شُدنی یعنی جنوبی قاف کے شاہزادے گرگیں قوی

چنگال نے بزور سحر مینا بنا کے بحر ظلمات کے ایک ٹاپو میں قید کر رکھا ہے۔ اور ہر روز اُس سے کہتا ہے کہ اے پریزاد مجھے اپنی غلامی میں قبول کر۔ لیکن وہ جواب دیتی ہے۔ کہ ماں باپ نے مجھے جس کے پلّے باندھا۔ میں اُسکی ہوں اور اُسی کی ہو کر رہوں گی +

پھر سُنا۔ کہ فیروز شاہ فوج لے کر گرگین پر جا چڑھا۔ اور اُسے شکست دیکر بیٹی کو چھڑا لایا۔ لیکن شاہزادی کو اس بات کا بڑا قلق ہے۔ کہ جسکی خاطر ہم نے عزیز و اقربا سے مُنہ موڑا۔ ماں باپ کو رُسوا کیا۔ اُس نے ہماری خبر تک نہ لی۔ سچ ہے۔ کہ آدم زاد خاکی نہاد رہ و رسم وفا کیا جانے ؟ اُسے ہمارا خیال ہوتا۔ تو جس طرح لندھور میں سعدان نے دردانہ پری کو قید سے چھڑایا تھا۔ اُسیطرح رقیب روسیہ کو عدم کا راستہ دکھاتا اور لڑ بھڑ کے ہمیں چھڑا لاتا +

---

یہ تو شاہ الفت حسین کا بیان ہے۔ لیکن اُن کے دشمنوں کو جن میں کچھ نیم کرسٹان ہیں۔ کچھ نئے فشن کے مسلمان۔ ان سب باتوں سے انکار ہے وہ نہ تو جن اور پری کے وجود کے قائل ہیں نہ سحر و طلسم کو مانتے ہیں۔ جب

اُن سے اُلفت حسین کے بیاہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تو کہتے ہیں۔ کہ اصل میں لوگوں نے اس بڈھے کو چونا لگایا مُفت میں نکّو بنایا۔ نہ فیروز شاہ جنّی کی کوئی اصل ہے نہ مہر نگار اور گرگین قوی ہیکل کا وجود ثابت ہے۔ یہ سب بادِ ہوائی باتیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ کلکتہ کے چند زندہ دل لوگوں نے یہ سارا سوانگ اس خوبصورتی سے رچایا تھا۔ کہ میاں اُلفت غچا کھا گئے۔ اور سچ مچ یقین کر لیا۔ کہ اُن کا بیاہ کوہ قاف کی شاہزادی مہر نگار سے ہو چکا ہے۔ بہرحال اصل واقعہ کچھ ہو میاں اُلفت کو ان سب باتوں کا یقین تھا۔ شہزادی مہر نگار سے مُدّت تک اُن کی خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔ اور اپنی محبوبہ کے خط اُنہوں نے بہت سنبھال کے رکھے تھے۔ اور اکثر اُنہیں دیکھ دیکھ کر فراقیہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

---

میاں اُلفت کو سر علی امام کلکتہ لائے تھے۔ اور مُدّت تک اُنہیں کی فیاضی پر اُن کا گذارہ ہوتا رہا۔ اُن کے کلکتہ سے چلے جانے کے بعد وہاں کے بعض رئیس اُن کی معاش کے کفیل ہو گئے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ سر علی امام نے ایک مرتبہ شاہ اُلفت حسین سے کہا۔ تم باقاعدہ ہمارے ہاں ملازم کیوں نہیں ہو جاتے؟ اُنہوں نے جواب دیا مجھے ملازمت

کرنے سے تو انکار نہیں۔ لیکن ہزار روپے سے کم تنخواہ نہیں لونگا۔ سر علی امام نے کہا۔ یونہی سہی۔ لیکن اگر تم سے کوئی غلطی ہوئی۔ تو جرمانہ ضرور کریں گے۔ الفت میاں نے یہ شرط قبول کر لی۔ اور میاں الفت حسین کام کیا کرتے تھے؟ بہت سے سادہ کاغذ سامنے رکھ کر بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی زور سے ہوا آئی۔ اور ایک کاغذ اڑ گیا۔ تو بیس روپے جرمانہ کھانے لگے۔ تو دس روپے جرمانہ چھینک آگئی۔ تو پانچ روپے تنخواہ سے وضع کر لئے گئے غرض ہر مہینے کبھی تو ہزار میں سے ۱۹۸۰ اور کبھی ۹۷۰ روپے یونہی کاٹ لئے جاتے تھے۔

---

دو تین سال ہوئے۔ کلکتہ سے ایک صاحب آئے۔ تو ان کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ شاہ الفت حسین کا انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن سنا ہے۔ کہ یہ عاشق صادق مرتے دم تک طریقِ عشق میں ثابت قدم رہا۔

---